راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا ۱۵واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

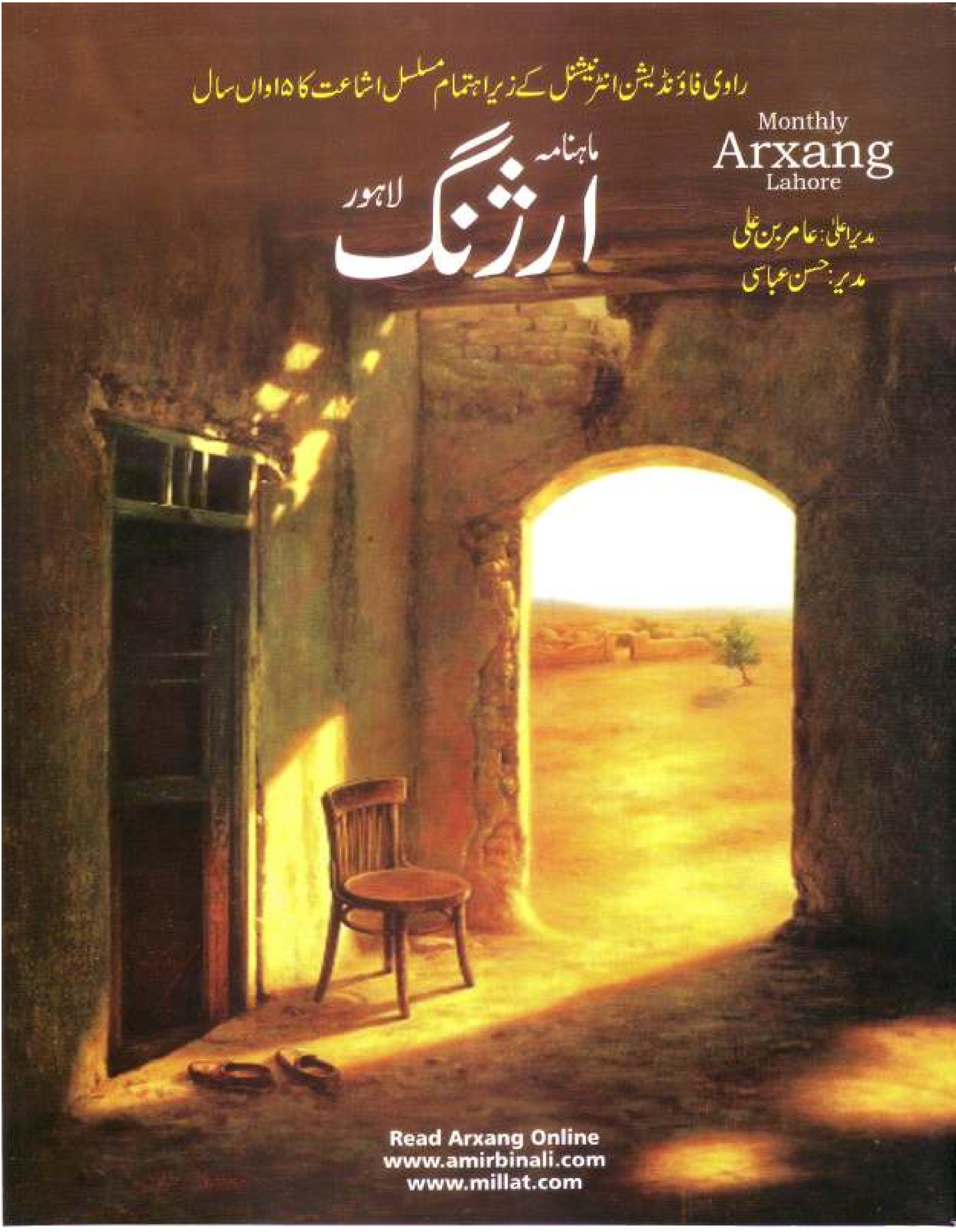

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

غزل میں ہنر زیادہ ہے اور آرٹ پیچھے رہ جاتا ہے: امجد اسلام امجد

ٹی وی ڈرامہ پہلے پورے معاشرے کی عکاسی کرتا تھا، اب صرف ایک مخصوص طبقے کو دکھانے لگا ہے

مجید امجد کی نظم ''آٹوگراف'' نے مجھے خرید لیا، آزاد نظم کی طرف رجوع کرنے کی اہم وجہ بنی

عہد ساز شاعر، منفرد ادیب اور صحافی امجد اسلام امجد کی عامر بن علی سے گفتگو

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا تعارف کروانا تکلف زائد محسوس ہوتا ہے جنہیں عرف عام میں سلیبرٹی کہا جاتا ہے، جو درحقیقت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی ہیں۔ امجد اسلام امجد شعروادب کا ایسا ہی ایک روشن ستارہ ہے۔ آپ ہمارے ملک کے ان چند گنے چنے خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنہیں کسی رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔ ان کے ساتھ پچھلے دنوں ڈیفنس لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر شام کی چائے کے ساتھ ہونے والی گفتگو ''ارژنگ'' کے قارئین کے لیے من وعن پیش کی جا رہی ہے۔

ارژنگ: شاعری سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں، آپ کا پہلا شعری مجموعہ فقط نظموں پر مشتمل تھا۔ حالانکہ آپ غزل بھی بھرپور کہتے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت رہی ہے کہ نئے لکھاری اپنے فنی سفر کا آغاز غزل سے کرتے ہیں۔ آپ کے اس باغیانہ رویے کی کوئی خاص وجہ تھی؟ اس وقت آپ کے ذہن میں کیا تھا جب آپ نے اس قدیم روایت سے بغاوت کی؟

امجد اسلام امجد: آپ نے بالکل صحیح کہا۔ اصل میں غزل اردو ادب میں شاعری کی فطری صلاحیت رکھنے والے حضرات کا نیچرل ذریعہ اظہار ہے۔ آپ اس میں سیٹ پریکٹس کر سکتے ہیں، فری فار آل ہے۔ اس جیسی سہولتیں کسی اور صنف میں نہیں۔ غالباً میں نے بھی شاعری کا آغاز غزل سے ملتی جلتی صنف سے کیا تھا، لیکن ہوا کچھ یوں کہ جب میں یونیورسٹی کے سالوں میں تھا اور کہنا چاہیے کہ لوگ ہمارے نام سے آشنا ہوئے، اس دور میں کچھ نظمیں شائع ہوئیں جن کو بہت مقبولیت ملی۔ دوسری وجہ جب مڑ کر میں دیکھتا ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے نظم کی انتخاب کی وجہ میری فطرت کا بنیادی رجحان بھی تھا۔ میں فطری طور پر چیزوں کو Totality میں دیکھتا ہوں۔ میرے ڈراموں میں بھی یہی چیز نظر آئے گی۔ آزاد نظم سے میں بہت بعد میں Hook ہوا۔ 1967ء میں میں نے پہلی آزاد نظم لکھی تھی۔ اس سے پہلے میں بھی یہی سمجھتا رہا کہ یہ کوئی بے وزن چیز ہے یا پھر آج کل جیسے نثری نظم ہے تو یہ اس ٹائپ کی کوئی چیز ہے۔ آہستہ آہستہ مجھے شعور ہونا شروع ہوا کہ یہ اس طرح کی چیز نہیں ہے بلکہ ہماری فارمل (Formal) شاعری ہے جو کسی خاص بحر میں کی جاتی ہے۔

یہ اس طرح کی چیز ہے اور اسی کی Extended شکل ہے۔ میں کالج کے زمانے میں کرکٹ کھیلنے کا بہت شوقین تھا۔ انہی دنوں مجھے کسی نے بتایا کہ کوئی شاعر مجید امجد ہیں۔ انہوں نے کرکٹ سٹار فضل محمود پر ایک نظم لکھی ہے۔ میں نے کرکٹ کے حوالے سے اس نظم میں دلچسپی ظاہر کی کہ دیکھیں شاعر نے کیا لکھا ہے۔ اس نظم نے جس کا عنوان آٹوگراف تھا مجھے انگریزی محاورے کے مطابق خرید لیا۔

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ شاعری میں اتنا ترنم ایسی مختلف صنف میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ نہ اس میں قافیے کی قید ہے نہ ردیف کی قید ہے۔ مگر حرمت قافیے اور ردیف سے بھی زیادہ آ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں وہ Turning point تھا جب میں آزاد نظم کی طرف آ گیا۔ اس نے مجھے ایسا کیا کہا میں نظم کا ہو کر رہ گیا۔ اس وقت جو میرے سینئرز تھے خاص طور پر احمد ندیم قاسمی صاحب ان کا مجھے بہت تعاون حاصل رہا۔ جب میری کتاب برزخ کی اشاعت کا وقت آیا، اس وقت تک میری بہت سی غزلیں چھپ چکی تھیں۔ ''فنون'' کے جریدے غزل نمبر اس کے آخری پورشن میں جدید ترین شعراء کے حصے میں پہلے نمبر پر میری غزلیں شائع کی تھیں لیکن میں نے خود سے سوال کیا کہ جو میرا اپنا نیچرل اظہار ہے، جس میں میری اپنی شخصیت جھلکتی ہے چونکہ غزل میں ایسے بڑے بڑے اساتذہ ہیں کہ آپ کو اپنی پہچان اور ناک نقشہ بناتے ہوئے ہی ایک عمر لگ جاتی ہے۔ چونکہ غزل میں مشق زیادہ ہے، غزل میں ہنر زیادہ ہے اور آرٹ پیچھے رہ جاتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر

مضامین

حمد و نعت: ریاض ندیم نیازی، منیر انور، سید ریاض حسین زیدی، احمد جلیل ۲

مضامین:

- ○ وائسرائے بازی جیت گیا / اسد اللہ غالب ۳
- ○ تلخ نوائی / محمد اظہار الحق ۴
- ○ افسانہ نگار ظہیر عباس کے نام ایک خط / جمیل احمد عدیل ۶
- ○ خوشبو کا ہم سفر / فرحت زاہد ۹
- ○ احمد فراز اور دردِ آشوب / ڈاکٹر نزہت عباسی ۱۱
- ○ "خود سے اجنبی" اور نوجوان شاعر غضنفر عباس / خورشید بیگ میلسی ۱۳
- ○ ڈاکٹر مرتضیٰ ساجد کا لمحوں کے گرداب / مظہر بخاری ۱۵
- ○ منفرد لہجے کی ممتاز شاعرہ اور کالم نگار ڈاکٹر صغریٰ صدف / شبنم لطیف ۱۷

طنز و مزاح

- ○ آہ ایف بی مخمور / عطاء الحق قاسمی ۱۹

متفرق شاعری: ۲۰ تا ۲۳

افسانے:

- ○ روگ / انیلا بھلر ۲۳
- ○ آؤ چاند کو چلیں / دستگیر شہزاد ۲۷
- ○ نفرت / نسیم سکینہ صدف ۳۰
- ○ براقش / اورنگ زیب ملک ۳۱
- ○ گردشِ دوراں / رانا محمد یعقوب ۳۳

شعری گوشے: معین نظامی، محمد ممتاز راشد، پریا تابیتا، غزالی، ڈاکٹر فوزیہ تبسم، خورشید ربانی، حسرت بلال حسرت، سردار عظیم اللہ خاں، وسیم عباس، ارمان یوسف ۳۴ تا ۴۳

ادبی خبریں / تقریبات ۴۶

تبصرۂ کتب ۵۰

نامہ ہائے احباب ۵۳

پنجاب رنگ ۵۵

"...اور مت پردہ پوشی کرو حق کی جھوٹ سے نہ چھپاؤ سچائی کو جب تم جانتے ہو" (القرآن)

MONTHLY ARXANG LAHORE.

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 15 مہینہ ستمبر 2013ء شمارہ نمبر ۹

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی مدیر: حسن عباسی

مدیرانِ اعزازی: ڈاکٹر صغرا صدف، ابرار ندیم، شازیہ نورین (اٹلی)

نائب مدیر: زبیر بشیر معاون مدیر: علی رضا، کامران ندیم، رخسانہ رخشی

مدیر پنجاب رنگ و انچارج شعبہ اشتہارات: نازو کاڑوی

قیمت فی شمارہ 60 روپے زرِ سالانہ مع ڈاک خرچ 1000 روپے

پتا برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ

اُردو بازار، لاہور 0300-4489310

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ مع ڈاک خرچ (پاکستان) 1000 روپے

سالانہ ممبرشپ مع ڈاک خرچ (برائے بیرون ملک پاکستان) 5000 روپے

رابطہ 0331-4489310 0300-4489310

ارژنگ دوست بیرونِ ملک

- امریکہ، شکیل سروش
- بحرین، اقبال طارق
- دوحہ، قیصر مسعود
- سعودی عرب، اسلم گمان
- دبئی، سلمان جاذب
- ابوظہبی، طارق بٹ
- کویت، صفدر علی صفدر
- یو کے، سعدیہ سیٹھی
- ناروے، ارشد شاہین
- شارجہ، نوید انور
- کینیڈا، شعیب صادق
- اسپین، نذیر اے قمر
- فرانس، اسد رضوی
- آسٹریلیا، ظفر اسلام
- سویڈن، عابدہ سیال
- ڈنمارک، صفدر علی آغا
- العین، سعید پسروری

Far East Marketing Co.
Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5,
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003, Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد باری تعالیٰ

اب مرادوں سے یہ جھولی مری بھر دے مولا
اپنی چاہت کے مجھے لعل و گہر دے مولا
کوئی جاگیر نہ منصب دے نہ زر دے مولا
دل کو پاکیزہ خیالات سے بھر دے مولا
بس گنہ گاروں کے رستے سے بچالے یارب
نیک لوگوں کی ہمیں راہگذر دے مولا
ہم کو محتاج کسی کا بھی نہ رکھیو یارب
سب کے کام آئیں ہمیں ایسا ہنر دے مولا
اب تو بس ایک ہی خواہش میں جیے جاتا ہوں
مجھ کو مکے کا، مدینے کا سفر دے مولا
تاج و دستار کی خواہش ہی نہیں ہم کو طلب
جس میں قربانی کا جذبہ ہو وہ سر دے مولا
مجھ کو اظہار ندامت کی عطا کر توفیق
اپنی چاہت میں مجھے دیدۂ تر دے مولا
میں بھٹک جاؤں نہ رستے سے مجھے یہ ڈر ہے
تو اندھیروں کو مرے نور سحر دے مولا
دل وہ دیجو کہ نہ ہو جس میں کوئی بغض ندیم
پاک ہو حرص و حسد سے وہ نظر دے مولا

(ریاض ندیم نیازی/سبی)

حمد باری تعالیٰ

زندگی کا مری آسان سفر ہو جائے
تیری رحمت کی پناہوں میں بسر ہو جائے
بندگی تیری ہے انساں کی سعادت مولا
تیرے در سے جو اُٹھے، خاک بسر ہو جائے
ایسے پھرتے ہیں بھٹکتے جو کٹے ہیں تجھ سے
جیسے دل پر کسی شیطاں کا اثر ہو جائے
تیرا ڈر سینے میں رکھے تیرا بندہ مالک
اور پھر سارے زمانے سے نڈر ہو جائے
تو نظر پھیرے تو مٹ جائیں نشاں منزل کے
تیری رحمت ہو تو دیوار بھی در ہو جائے
کامیابی ہے مقدر میرے اللہ اگر
تیرا فرمان مری سوچ کا پر ہو جائے
اس کی خوشنودی رہے ذہن میں ہر پل انور
راستہ اس کا تری راہ گزر ہو جائے

(منیر انور/لیاقت پور)

نعت

میرا ایماں ہو سلامت، زہے قسمت میری
تا ابد زندہ رہے آپؐ کی نسبت میری
دل و جاں جھوم اُٹھیں، آپ کا رستہ دیکھیں
پر جبریل کی پرواز ہو رفعت میری
بگڑی بن جائے اگر آپؐ کے قدموں میں رہوں
فلک آسا مجھے رکھے گی اطاعت میری
آپؐ کی نذر کروں سارے اثاثے اپنے
سرخرو ہوتی رہے ایسے سخاوت میری
آپؐ کی بات سنوں، آپ کو ہر دم سوچوں
مستند ہے تو یہی ایک عبادت میری
نور کا ذکر ہوا نور کا منبع چمکا
اے خوشا! ہو گئی پرنور محبت میری
جس طرح آپؐ نے اغیار کو اپنایا ہے
"عفو" کی زندہ علامت ہو مروت میری
ہو ریاضؔ ایسا کہ بس آپؐ کی خوشبو مہکے
گلشن زیست میں کام آئے ریاضت میری

(سیّد ریاض حسین زیدی/ساہیوال)

نعت رسولؐ

ابتدا انتہا روشنی روشنی
آمد مصطفیٰ روشنی روشنی
جو فروزاں ہدایت کے مینار ہیں
ہر جگہ جابجا روشنی روشنی
آپؐ کی ذات منبع انوار ہے
آپؐ کا راستا روشنی روشنی
آپؐ کا اُسوۂ پاک رہبر مرا
آپؐ کی ہر ادا روشنی روشنی
جلوۂ مصطفیٰ مجتبیٰ مرتضیٰ
مرحبا مرحبا روشنی روشنی
انؐ کے مطلع انوار کو دیکھ کر
مہر و ماہ نے کہا روشنی روشنی
نامہ بر نے جو پوچھا پتہ تو کہا
آپؐ کا ہے پتا روشنی روشنی
عاصیوں سے جلیلؔ اُن کی ہے جو وفا
ہے عطا ہی عطا روشنی روشنی

(احمد جلیل/اوکاڑہ)

وائسرائے بازی جیت گیا

اسد اللہ غالب

مجھے جب محمد سرور نے نوے شاہراہ قائداعظم کے سامنے فائیو سٹار ہوٹل کی لابی میں جاپان سے آئے ہوئے نوجوان شاعر عامر بن علی کی موجودگی میں اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ اسے زندگی میں جو کچھ ملا ہے وہ برطانیہ سے ملا ہے تو میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ میرے دلائل کام آ گئے۔ اس نے کہا کہ وہ ہائی کمشنر بننے کی پیشکش کو مسترد کر چکا ہے۔

مجھے علم نہیں تھا کہ سرور کے ترکش میں ابھی کئی تیر باقی ہیں اور وہ اس ملک کی شہریت پر لات مار سکتا ہے جس نے بقول اس کے اسے دولت دی، عزت دی، پارلیمنٹ کی رکنیت دی اور بار بار دی۔ وہ اس کارلا حاصل سے اکتا گیا تو اس نے اپنی سیٹ نوجوان بیٹے انس سرور کو سونپ دی۔ برطانیہ میں بھی موروثی سیاست کا سکہ چلتا ہے۔ اس کا نوعمر بیٹا انس سرور دیکھتے ہی دیکھتے بام عروج تک پہنچا۔ وہ سکاٹ لینڈ میں اپنی لیبر پارٹی کا ڈپٹی لیڈر ہے۔ محمد سرور نے اعلان کیا کہ وہ سیاست سے ریٹائر ہو رہا ہے۔ کیونکہ اسے اور اس کے بال بچوں اور ان کے بال بچوں کو جان سے مارنے کی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ ان دھمکیوں کا پس منظر یہ تھا کہ گلاسگو میں تین پاکستانی نوجوانوں نے ایک گورے نوجوان کو قتل کر دیا اور وہ جان بچانے کے لیے پاکستان بھاگ آئے۔ پاکستان اور برطانیہ کے مابین مجرموں کی حوالگی کا کوئی معاہدہ نہیں تھا لیکن محمد سرور نے پاکستان میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے ان نوجوانوں کو واپس لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انہیں سخت سزائیں سنائی گئیں۔ یہی کچھ اس لڑکی کے ساتھ بھی ہوا جس نے پسند کی شادی کرنا چاہی مگر اس کا باپ اسے پاکستان لے آیا۔ محمد سرور نے اس لڑکی کو بھی برطانوی بنیادی حق دلانے کے لیے زور آزمائی کی اور اسے واپس گلاسگو پہنچا دیا۔ جہاں اسے مرضی کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔ یہی کچھ جنرل مشرف بھی کرتا رہا اور امریکہ اور دیگر ممالک کو مطلوب پاکستانیوں یا یہاں موجود غیر ملکیوں کو ملک بدر کر کے مال پانی بناتا رہا۔ عافیہ کا سانحہ ہمارے کردار پر بدنما داغ ہے۔ محمد سرور نے جو کچھ کیا۔ وہ برطانوی قانون کی فرمانروائی کے لیے کیا۔ وہ اپنے آپ کو محب وطن برطانوی ثابت کرنا چاہتا تھا اور ملکہ معظمہ سے وفاداری کے حلف کا تقاضا بھی یہی تھا۔ یہی وہ حلف ہے جس کے پیش نظر پاکستانی میڈیا نے علامہ کینیڈی عرف شیخ الاسلام کو پاکستانی سیاست میں منہ مارنے کا حق نہیں دیا اور عدالت عظمیٰ نے بھی چند منٹوں میں علامہ کینیڈی کو کینیڈے میں آنے پر مجبور کر دیا مگر جو نسخہ محمد سرور استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ علامہ کینیڈی کو معلوم نہ تھا۔ وہ بھی ہر صورت میں پاکستان میں اقتدار کے لیے کوشاں ہوتا تو اپنی کینیڈین شہریت پر عارضی طور پر لات مار سکتا تھا۔ کینیڈین شہریت تو اسے چند لاکھ کے عوض پھر بھی مل سکتی تھی۔

اخبارات محمد سرور کی بطور گورنر پنجاب ممکنہ تقرری کی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں اور مارکیٹ میں اخبارات بعد میں آئے۔ انٹرنیٹ پر ایک بحث سحری کے وقت ہی شروع ہو گئی کہ کیا پاکستان کی قسمت میں امپورٹڈ صدر، وزیر اعظم اور گورنر لکھ دیے گئے ہیں۔ معین قریشی تو اس شان سے نازل ہوئے کہ انہیں پاکستان کا شناختی کارڈ اسلام آباد پہنچنے پر دیا گیا۔ شوکت عزیز بھی باہر سے آ کر من مانی کرتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک بریف کیس کے ساتھ آیا ہوں۔ اس کے ساتھ واپس چلا جاؤں گا۔ بڑا احسان کیا انہوں نے کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ایک زمانے میں غلام محمد امریکی طیارے پر اترے اور سیدھے گورنر جنرل آف پاکستان کا حلف لینے تقریب میں پہنچ گئے۔ پانچ سال سے ہماری عدلیہ اور الیکشن کمیشن اس کوشش میں ہیں کہ دوہری شہریت والوں کا سراغ لگائیں۔ مگر یہ لوگ پچھاڑی ہی نہیں دیتے۔ بھارتی سیاست میں ایک غیر ملکی عورت سونیا گاندھی کو یہ جرأت نہیں کہ وہ کانگریس پر مکمل اختیار رکھنے کے باوجود اقتدار کی راہداریوں کا رخ کر سکے۔

کیا محمد سرور گورنر پنجاب لگیں گے یا صدر پاکستان بنیں گے۔ سوشل میڈیا پر یہی بحث ہو رہی ہے۔ وہ اپنی برطانوی شہریت چھوڑ دیتے ہیں تو دونوں اعلیٰ ترین عہدے ان کے قدموں میں ہوں گے۔ مگر کیا سپریم کورٹ کے فیصلے کی روح بچی تھی۔ کیا برطانوی وزیر خارجہ ولیم ہیگ اور اس سے پہلے برطانوی وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون کی آگے پیچھے پاکستان آمد کا مقصد یہی ہے کہ وہ پاکستان میں ایک وائسرائے کے تسلط کے لیے لابی کریں۔ ابھی تو امریکی وزیر خارجہ جان کیری نے آنا ہے۔ وہ روٹھے روٹھے پھرتے ہیں کہ ہمارے فارن آفس کے ایک اہلکار نے امریکی سفارت کار کی بے توقیری فرما دی۔ مگر کیری صاحب کو آخر تو آنا ہے اور ان کی بغل میں بھی نجانے کن کن بقراطوں اور افلاطونوں کے لیے فرمائشوں کی فائلیں ہوں گی۔

محمد سرور ایک اچھے انسان ہیں لیکن پاکستان میں بیس کروڑ انسان بستے ہیں۔ ان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر اچھا ہے۔ میں یہ ساری باتیں اس بحث کے تناظر میں کر رہا ہوں جو شیخ الاسلام کی کینیڈا سے اچانک پاکستان آمد کی وجہ سے چھڑی اور جس میں ہم نے دوہری شہریت والے اوورسیز پاکستانیوں کو جی بھر کے رگڑا دیا۔ تنخواہ دار دانشور اس بحث میں پیش پیش تھے مگر اب وہ محمد سرور کی تقرری پر بڑھ بڑھ کر بریکنگ نیوز چلا رہے ہیں۔ محمد سرور میرے چند بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ مگر میں ان کی خاطر ان اصولوں کو بالائے طاق نہیں رکھ سکتا۔ جو سپریم کورٹ نے طے کیے تھے اور جن کی روح اور سپرٹ سے کسی کو انکار کی مجال نہیں۔ یہ دوہری شہریت والے پاکستان پر کیوں حاوی ہو رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں کی جلاوطن قیادت کی کسی نہ کسی اوورسیز پاکستانی نے خدمت کی ہے۔ اگلی خدمت کا صلہ پاکستان کے خزانے سے بخشیش کے طور پر دینے کے بجائے یہ جلاوطن رہنے والے لیڈران کرام اپنے ذاتی خزانوں سے انہیں جتنا مرضی انعام واکرام عطا فرمائیں۔ کسی کو کوئی گلہ نہیں ہو گا لیکن بیس کروڑ پاکستانیوں کی صلاحیتوں پر عدم اعتماد کرتے ہوئے ان وائسرائے صاحبان پر مملکت پاکستان کے آئینی عہدے نچھاور کرنا کچھ سے بالاتر ہے۔ پاکستان سے جو لوگ ترک وطن کر کے باہر چلے گئے اور اپنی مرضی سے وہاں کے شہری بن بیٹھے۔ اب مسئلہ شہریت چھوڑنے سے حل نہیں ہوتا۔ مگر وہ جو محاورے کی طرح مشہور ہے کہ لوگ دنیاوی مفاد کے لیے دین ایمان تک کا سودا کر لیتے ہیں۔ خدا کے لیے اسے سچ ثابت نہ کیا جائے۔ محمد سرور کو اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ چند روزہ تو ہر پنے سے انہیں اور کیا مل جائے گا۔ رہا بزنس تو وہ پانچ دس کروڑ کے آم خریدیں، برطانیہ کی منڈی میں لے جائیں۔ ان کے بنک بیلنس بھر جائیں گے۔

عامر بن علی کا ایک شعر محمد سرور کے ذوق مطالعہ کے لیے:

حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

تلخ نوائی

محمد اظہار الحق/اسلام آباد

ناصر علی سید کو میں جب بھی دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں یہ نکتہ اُٹھتا ہے کہ پشاور میں ناصر علی سید کی وہی اہمیت ہے اور وہی کردار ہے جو کسی زمانے میں لاہور کے حوالے سے صوفی تبسم، ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری اور اس سے بھی پہلے محمد حسین آزاد کا تھا۔ یہ جو پشاور کی کہکشاں ہے جس کے ستاروں میں محسن احسان، عزیز اعجاز، سجاد بابر، نذیر تبسم کا نام آتا ہے (افسوس! غلام محمد قاصر اور یوسف رجا چشتی بچھڑ کر بہت دور چلے گئے ہیں اور محسن احسان بھی اور اس سے بھی پہلے خاطر غزنوی کا نام تھا تو ناصر علی سید اس کہکشاں کا تابندہ اور کیا ہی رخشندہ ستارہ ہے۔ پشاور کے ادبی اور تہذیبی خاکے میں دل آویز رنگ بھرنے والوں میں وہ ایک نابغہ ہے۔ شہر، شہر سنگدل ہوتا ہے اور ہر شہر شہر ناپرساں ہوتا ہے۔ یہ شاعر اور ادیب ہوتے ہیں، جو شہر کو پتھروں کے شہر سے انسانوں کا شہر بناتے ہیں۔ اسی لیے تو شاعر نے کہا تھا:

کوئی رومی کوئی حالی کوئی اقبال پیدا کر
کہ شہروں کی بڑائی ان کے میناروں سے ہوتی ہے

اہل پشاور کو تبریک کہ ان کے شہر کو اونچے مینار میسر ہیں۔ ان میناروں پر روشنی ہے اور ناصر علی سید ان میں ایک بڑا مینار ہے۔

''شامیں فریب دیتی ہیں'' جہاں متاثر کرتی ہے اور محظوظ کرتی ہے وہاں پریشان بھی کرتی ہے اور پڑھنے والا اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ ناصر علی سید محبت اور معاملات کا شاعر ہے یا عوام کے مسائل کا۔ یوں لگتا ہے جیسے ناصر علی سید محبت کی طرف بڑھتا ہے تو اسے پیچھے سے خلقِ خدا کی سسکیوں کی آواز آتی ہے۔ وہ مڑتا ہے لیکن ابھی دو چار قدم ہی اُٹھاتا ہے کہ محبت کا کوہِ ندا واپس بلا لیتا ہے۔ وہ جو احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

تو ذرا چند گھڑی پار اُفق پر ستا
میں ذرا دن سے نمٹ کر شب تار آتا ہوں

تو یہی حال ناصر علی سید کا ہے وہ جیسے ہی کہتا ہے:

گھبرا کے مرے شانے پہ وہ جھک سا گیا تھا
جب چاند دریچے کے برابر میں رُکا تھا

تو اسے معیشت کے بڑھتے ہوئے گرد و ریت میں عوام کی بدحالی یاد آتی ہے اور وہ کہتا ہے:

ہونٹوں پر مرے دھوپ نے جب پیاس لکھی تھی
اس وقت میں دریا کے کنارے پہ کھڑا تھا

وہ ایک طرف چھت پر لہراتے بالوں کے ساون بھادوں کا خواب دیکھتا ہے تو دوسری طرف:

ملے گا کچھ بھی نہ تم کو بجز پشیمانی
یہ دور ایسا ہے سب اپنے خواب رہنے دو

لیکن انصاف یہ ہے کہ ناصر نے جہاں محبت اور معاملات کے شعر کہے وہاں مسحور کر کے رکھ دیا اور جہاں زندگی کی حقیقتوں کے پردے چاک کیے وہاں تلخ سنجیدگی لانے میں پوری طرح کامیاب رہا۔ اس نے تغزل کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا:

اس نے میرا بھی حال پوچھا تھا
میں بھی عزت مآب تھا کل شب
ورق کچھ ڈائری میں رہ گئے ہیں
جوانی کو دوبارہ ڈھونڈتا ہوں
وقت کی شاخ سے بچھڑے لمحے
ان میں تھا ایک میرا پہلا دن
چلو میں بھول جاتا ہوں چلو تم یاد مت کرنا
چلو اب زعم میں اپنی انا کے سانس لیتے ہیں
تقریب تیری یاد کے کمرے میں بپا تھی
میں صدر بھی...... سامع بھی تھا خود بول رہا تھا

حیرت ہوتی ہے کہ عشق کی چادر اوڑھے دنیا و مافیہا سے بے خبر یہی ناصر علی سیّد جب زندگی کے ہنگاموں میں اُترتا ہے تو جیسے دوسرا جنم لیتا ہے دیکھیے اقتدار کے زوال کا کیا نقشہ کھینچتا ہے کیا تیور ہیں اور کیا طنز ہے:

کل تو کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہ دیا
آج لیکن مری سرکار ذرا آہستہ
وقت نے دیکھ لیا کیا حال کیا ہے تیرا
اے مرے دوست مرے یار ذرا آہستہ

عالمی سیاست جب سے یونی پولر ہوئی ہے پوری دنیا اٹلانٹک کے اس پار کنٹرول ہو رہی ہے۔ ملکوں کے تاجدار ایک ہی دہلیز پر سربسجود ہیں۔ قوموں کی تقدیر کے فیصلے کولمبس کی نئی دنیا سے ہو رہے ہیں۔

اس عالمی استبداد کا نشانہ ہم بھی ہیں۔ ہمارا شاعر ان تلخ، زمینی حقائق کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور تلخی میں شاعری کی نزاکتوں اور روحِ فن کو مجروح نہیں ہونے دیتا:

دکھاتا دور سے ہے دودھ اور شہد کی نہریں
مگر ان تک پہنچنے کے کبھی ویزے نہیں دیتا
عجب اک زعم ہے اس کو زمینوں پر خدائی کا
مری بستی میں مجھ کو پھولنے پھلنے نہیں دیتا
غریب شہر کا دشمن فقیہ شہر بھی تو ہے
کوئی فتویٰ امیر شہر کے ڈر سے نہیں دیتا

غریب شہر، فقیہ شہر اور امیر شہر تینوں ترکیبوں کا استعمال ایک شعر میں ہوا ہے اور شعر بوجھل نہیں ہوا۔

المیہ یہ ہے کہ میں پیشہ ور نقاد نہیں اور میرے کیسے میں وہ اوزار نہیں جو ہمارے نقاد کاندھے پر رکھے گلی گلی ''چھُری پیڑھی بنوا لو'' کی آوازیں لگاتے ہیں اور میرے پاس زیورِ طباعت سے آراستہ وہ فارم بھی نہیں جن پر سب کچھ لوگ ہوتا ہے اور صرف خالی جگہوں پر مصنف اور کتاب کا نام بھرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اگر آپ کو میرے اس مضمون میں ایسے فقرے نہیں سنائی دے رہے جو آپ کے سر کے اُوپر سے گزر جائیں اور جن میں الفاظ کئی کئی من بھاری ہوں تو میں بصد ادب و عجز اعتذار کرتا ہوں اور آخری نکتہ بیان کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ محبت یا سیاست، معاشرت یا معاملات، ناصر علی سید شاعری کرنا جانتا ہے لیکن تحن گسترانہ بات یہ ہے کہ اچھا شاعر، اچھا کیوں ہوتا ہے؟ یہ آج تک کوئی نہیں بتا سکا۔ جس طرح رحمِ مادر میں پرورش پانے والے بچے کو یہ سمجھانا ممکن نہیں ہوتا کہ دنیا کیسی ہے۔ جس طرح بینائی سے محروم شخص کو یہ باور کرانا ناممکن ہے کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ جس طرح لغت یہ بیان کرنے سے قاصر ہے کہ پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں کس قدر عزیز ہیں۔ جس طرح خارج از وزن شعر پڑھنے والے کو دنیا کی کوئی طاقت موزوں انداز میں پڑھانا نہیں سکھا سکتی، دنیا کی پوری تاریخ میں ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ شعر کو وزن میں پڑھنا سکھانے کے لیے یا نا شاعر کو شاعر بنانے کے لیے کوئی مکتب کوئی مدرسہ کوئی ادارہ بنا ہو۔ اسی طرح میرے لیے ممکن نہیں کہ ناصر علی سید کے جو شعر میں آخر میں سنانے لگا ہوں وہ مجھے کیوں اچھے لگتے ہیں۔ بس یہ اشعار دامنِ دل کھینچتے ہیں۔ ان میں لفظیات، بندش، چستی، بنت، مضمون کا ترفع، تغزل سب کچھ ہے اور وہ کچھ بھی ہے، جس کا نام ہی نہیں۔

اپنی سب دعاؤں کو لکھ دیا ہے ساحل پر
اور ٹوٹی کشتی کو پانیوں سے باندھا ہے
خواب کے جزیروں میں بے اماں ہواؤں نے
کج ادا چراغوں کو وحشتوں سے باندھا ہے
مضطرب ہے لمحوں میں ہم نے دل کی ٹہنی پر
ایک زرد سا پتہ انگلیوں سے باندھا ہے
کس جیت کی اُمید پہ زندہ رہے کوئی
ہے کارِ محبت میں خسارہ ہی خسارہ

جوں جوں یہ شعری مجموعہ ہم پڑھتے ہیں نشہ ہے کہ گہرا ہی ہوتا جاتا ہے۔ بند قبا ہیں کہ کھلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ کیا پیرایہ بیان اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہوسکتا ہے:

اک شال کہ کندھے سے سرکتی چلی جائے؟

کینیڈا میں مقیم اُردو اور پنجابی کی
معروف شاعرہ تن دیپ تمنا کا
اُردو شاعری کا پہلا مجموعہ
''پہلا گیت محبت کا''
خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ میں
شائع ہوگیا ہے

مبارک باد

ہم جناب ظفر اقبال کو (شاعری) اور جناب عطاء الحق قاسمی کو (طنز و مزاح) میں ہلال امتیاز، ڈاکٹر یونس جاوید، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور جناب ایوب خاور کو (لٹریچر)، جناب شاہ نواز زیدی کو (آرٹ) میں حکومت پاکستان کی جانب سے پرائڈ آف پرفارمنس ملنے پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ (ارژنگ)

افسانہ نگار ظہیر عباس کے نام ایک خط

جمیل احمد عدیل

ڈیئر ظہیر! تمہارا افسانہ ''ساجو کی ماں.....'' میں نے اول تا آخر پڑھ لیا ہے۔ اُردو افسانے کو جس نئے نام کی ضرورت تھی، میری معروضی رائے میں وہ تمہارا نام بھی ہو سکتا ہے اور اس کی بڑی ہی اساسی وجہ ہے کہ ہمارے بیشتر 'لکھنے والے' جس دن قلم تھام لیتے ہیں، پڑھنا بند کر دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں پڑھنے کا عمل وقت ضائع کرنے کا مترادف ہو جاتا ہے۔ تم نے بلاشبہ بہت پڑھا ہے اور پڑھ رہے ہو، اسی لیے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے تمہارا معیار خاصا بلند ہے۔ تمہاری کہانیوں کے موضوعات میں حیران کن ندرت ہے اور اسلوب اس لیے انفرادیت کا اہتمام کرتا ہے کہ تنقید تمہاری دلچسپی کا محور ہے۔ اس افسانے کی ابتدائی سطور مذکورہ موقف پر شاہد ناطق ہیں۔ فی الاصل اعتقادیات کے باب میں ادراک شعور ہی اپنی 'ٹلکھوں' کے حوالے سے فیصلہ کن تعینات قلب ونظر میں ترازو کرتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے تخلیقی صفت الگ سے کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ جیسے یہ نظریہ کہ جسم میں جان کوئی علیحدہ وجود نہیں ہے۔ بدن کا Functional ہونا ہی اس کی زندگی ہے۔ جب اعضا کا تعامل رک جاتا ہے تو جسم/سر/بدن بے حس وحرکت ہو جاتا ہے۔ یہی زیست کا خاتمہ ہے نہ جسم میں الگ سے جان پڑتی ہے اور نہ نکلتی ہے۔ وہی شاعرانہ خیال (جو اَب حقیقت کا زیادہ مؤثر ترجمان محسوس ہو رہا ہے)۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

اسی طرح تخلیقیت یا تخلیقی جوہر بھی علیحدہ سے کوئی اکائی نہیں ہے۔ یہ بھی ذہن یا شعور کی فعلیت سے وابستہ ایک شے ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک نتیجہ ہے۔ جب ہم کسی خاص صنف کا مطالعہ کرتے ہیں اس کی گرامر، اس کے پیراڈائم کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کی روایت سے آگاہ ہوتے ہیں، اس کی ارتقائی منزلوں سے آشنا ہوتے ہیں، اس کی کرافٹ کا فہم حاصل کرتے ہیں..... اور یہ سارے ''اعمال'' خالصتاً اکتسابی ہیں تو ہمیں ایک خاص نوع کی سوجھ بوجھ حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے دو بنیادی ماخذ ہیں۔ اس خاص صنف کا براہِ راست مطالعہ نیز اس سے جڑی تنقید کو پڑھنا۔ بس ان مصادر سے رشتہ قائم کرتے ہم سوچتے ہیں، پھر اس میں Live کرتے ہیں۔ یوں دھیرے دھیرے ہمیں فارم تک رسائی میسر آ جاتی ہے۔ گویا یہ کافی حد تک ارتکاز کا انعام ہے۔ باقی رہے موضوعات تو سب کچھ ہمارے گردو پیش میں کثرت سے بکھرا ہوا ہے۔ غالبؔ کے خیال میں مضامین غیب سے آتے ہوں گے۔ صریرِ خامہ کو نوائے سروش کہنا انھیں زیبا ہے کہ شاعروں کو ادعا میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ یوں بھی اپنے تخلیقی سرچشمے کو کسی پُراسرار دنیا سے منسوب کرنے میں کچھ طلسمات سے قائم ہو جاتے ہیں۔ اگر کچھ وہبی ہے تو وہ صرف وحی کا تجربہ ہے۔ ہم عام انسان ہیں، ہمارا وجود کسی مرحلے میں منہا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا سیکھا ہوا، ہمارا پڑھا ہوا، ہمارا غور کیا ہوا، ہمارا دیکھا ہوا، ہمارا سنا ہوا، ہمارا سوچا ہوا ہی ہمارے سپنوں میں متشکل ہوتا ہے۔ ہماری عبارتوں میں صورت پذیر ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس گھڑی تک ایسا کوئی Abstract ''ایجاد'' نہیں ہوا جس کا موجودات سے ناتا نہ ہو۔ ہماری Elevated ہونے کی آرزو اپنی جگہ، ہماری کوہِ طور پر سیاحت کی تمنا اپنی جگہ مگر ہم اپنے وجود کی مادیت سے اوپر اُٹھ نہیں سکتے۔ جب ہم ارتفاع کی واردات میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ہماری State of Mind ایک سطحِ مرتفع پڑھو ہار دریافت کر لیتی ہے لیکن عجیب اتفاق کہ یہ تجرید بھی وجودیات کے مدار سے کہیں باہر واقع نہیں ہوتی۔ زندان کو لاکھ دنیا سے Isolate کر لیجیے۔ رہے گا وہ اسی جہان میں تخیل کتنا ہی رفیع الشان کیوں نہ ہو، کیسا ہی عالم تو تشکیل کیوں نہ کر لے، اس کے ڈانڈے بہر نوع اُس ملگجی سی نیم مرطوب روئی سے متعلق رہیں گے جسے عرفِ عام میں بھیجا کہا جاتا ہے۔ Mystery اسی کے لیے ہے جو اس سے واقف نہیں ہے۔ سریت، اسی کے لیے ایک پُراسرار منطقہ ہے جس کی پہنچ سے وہ باہر ہے۔ ایک کا شہود ہی دوسرے کا غیب ہے And Vice-versa واضح رہے یہ نقطۂ نظر Meta Physics کی تردید ہرگز نہیں کر رہا اور ایک Revelationist ایسی جسارت کر بھی کیسے سکتا ہے۔ گزارش تو بس اتنی سی ہے کہ ہم اپنی تخلیق کو منزل من اللہ قرار دینے میں بے قراری سے گریز اختیار کریں تو زیادہ معتدل ہونے کا ثبوت دیں گے۔ Prophethood کا تجربہ بہت ہی اُونچے درجے کی چیز ہے۔ سر سر او ہب!! ہم تخلیق کاروں کی اپنی حدود ہیں۔ بھلے ہی ہماری مدرکہ بجا

طور پر عجز کی مظہر بن جائے پھر بھی ایک حد لگی ہوئی ہے۔ہم اپنے آپ ہی سے برآمد ہوتے ہیں۔ظہیر! یہ باتیں صرف تمہیں Quote کرنے کے لیے کہی گئی ہیں:

''تخلیقی عمل کی تفہیم میرے لیے ہمیشہ چیلنج رہی ہے۔''

اس پر کوئی اضافہ مقصود نہیں۔خود تم معترف ہو کہ ایسے افسانے زندگی کے کسی حقیقی واقع سے ماخوذ ہوتے ہیں۔مگر وہ معمولی واقعہ لکھنے والے کے تخیل سے کیا سے کیا بن جاتا ہے۔یہاں یہ زاویہ منکشف کرنا مطلوب ہے کہ وہ 'تخیل' بھی اُترا ہوا یا Imported نہیں ہوتا۔اس واردات کا مرکز بھی یہی کہیں ہے، لیکن اس نیوکلیس تک پہنچنے کے لیے کئی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں اور تم نادیدہ سمتوں کے سراغ پر نکلے ہوئے راہی ہو۔تمہارا یہ افسانہ چونکہ ایک نوع کی سریت کے ساتھ بریکٹ ہے۔لہٰذا اس کی ماورائیت گفتگو کے در کو بند بھی کر سکتی ہے اور کسی واقع کا ماورائے عقل ہونے کا بجز اس کے اور مطلب ہو بھی کیا سکتا ہے کہ اسے تسلیم کرو یا نہ کرو۔بہر حال یہ موضوعِ سخن نہیں بن سکتا۔کیا تمہارا یہ افسانہ قاری کو متحیر کر کے اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر ثبت کر دینے کے عمل تک محدود ہے؟ یا اس کی Mystery کو Unfold ہونے کی دعوت اس میں پوشیدہ ہے؟ مؤخر الذکر نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے Rationalism کے حق میں سب سے بڑی دلیل بھی یقین کیا جا سکتا ہے۔خواب ایسے ہی تو نہیں تعبیروں کے تعاقب میں دیوانے ہوئے پھرتے!! راز ایسے ہی تو نہیں بے نقاب ہونے کی تمنا میں گڑگڑا رہے!! علامتیں بے حجاب ہونے کے شوق میں یونہی تو ہلکان نہیں ہوئے جا رہے!! معنی وہ حسن ہے جو لفظ کا ستر تار تار کر کے عریاں ہونے کے لیے حد سے زیادہ بے کل رہتا ہے۔تخلیق کے جہان میں بے نیازی کے عنوان سے کوئی مخلوق نہیں پائی جاتی۔جی جناب! اس سنسار میں مراد کی کامنی دوشیزہ اُونچی چتون کے ساتھ شارح پر برابر ڈورے ڈالتی رہتی ہے۔

ظہیر! اس کہانی کا آغاز ایک تنقیدی مضمون کی طرح کیا گیا ہے۔یوں اس کی ابتدا اس افسانے کو ممتاز اور منفرد کر رہی ہے۔اس کے باوصف اس کے واحد متکلم کو افسانہ نگار سے منسلک کر دینا غالباً درست نہیں ہوگا۔فی الاصل افسانہ نویس کی اپنی شمولیت ایک التباس ہے۔وہ اپنی ذات کو افسانے کی حریم سے دور رکھتے ہوئے ''اپنے'' کردار کو اس بنت کا حصہ بناتا ہے۔بھلے ہی وہ راوی رہے، وہ خود نہیں ہوتا، اس کہانی کی نسبت سے اپنی توسیع ہوتا ہے لیکن اس ''مجرد کارروائی'' کے علی الرغم اپنے وجود کی ترجمانی کے سلسلہ بہر رنگ قائم و دائم رہتے ہیں۔درحقیقت توڑ جوڑ کی اس پیچیدگی سے ہمارے اکثر لکھنے والے واقف نہیں ہوتے کہ آرٹ بعض اوقات بڑی جانگسل ریاضت مانگتا ہے۔یک رُخے، اکہری سطح پر زیست گزارنے والے صالح تو ہو سکتے ہیں مگر بڑے آرٹسٹ نہیں ہو سکتے۔آرٹ تو بڑی ہی عجیب تخلیقی منافقت کا متقاضی شعبہ ہے۔

ظہیر! یاد ہے ایک بار تم نے یہ شعر سنایا تھا:

جمالِ یار میں رنگوں کا امتزاج تو دیکھ
سفید جھوٹ ہے ظالم کے سرخ ہونٹوں پر

یہی ہے وہ کلا جو ایک کلاکار کے پاس ہونی چاہیے۔دروغ بافی کوئی سادہ خاطروں کا کھیل ہے؟ جھوٹ کو دلکشی عطا کرنے کا ہنر کسی ذہین حسین کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔جو کامران ہرجائی نہیں وہ کہاں کا محبوب ہے؟ واعظ و ساقی دونوں سے بیک وقت دوستی نبھا کے دکھانا ہی اصل فن ہے۔واقعتاً یہ شعر تمہارے محشر خیال کا پیش کار ہے۔تمہاری کہانیاں گواہی دیتی ہیں کہ تم ایک سے زیادہ سطحوں پر اپنے احساسات کی سلطنت قائم کرنے پر قادر ہو۔تم ایک سے زیادہ کمروں میں ایک وقت میں رہ سکتے ہو۔تم نے رنگوں کے امتزاج کی سائنس سیکھ لی ہے۔اسی لیے آرٹ کے دائرے ایک دوسرے کو مس کرتے ہوئے تمہارے وجود میں رقص کناں رہتے ہیں۔اپنے وجود کو حسب ضرورت اکائیوں میں تقسیم کرتے رہنا اور از سر نو وحدت میں ڈھال لینا۔دولخت یا دو نیم کرنے کی یہ جراحی ہما شما کے بس کا روگ نہیں ہے اور تم نے اس اذیت ناک شغل کو مدت مدید سے اپنا رکھا ہے۔میں شاہد ہوں کہ تمہارے وجود کا طوفانی تحرک ایک تحیر زا مرکزہ سکون بھی رکھتا ہے۔مگر اس سے زیادہ حیران کن یہ Phenomenon ہے کہ سارے طوفان جملہ تلاطم اسی مرکز سے پھوٹتے ہیں۔

تم وہ بے رحم شخص ہو جو افسانہ لکھنے کے لیے بنی بنائی زندگی اور رشتوں کی رسّی کو پارہ پارہ کر سکتے ہو۔اپنے افسانے کی ولادت کے لیے تم Scissors کو یوں استعمال کرتے ہو کہ یہ تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل لگتا ہے لیکن کمال تمہیں یہ حاصل ہے کہ سیزیرین ہونے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔بالکل نارمل ڈیلیوری محسوس ہوتا ہے۔جدت کا ہنر آزمانے کے باوجود ہم نے پلاٹ کی روایت سے دست کشی اختیار نہیں کی۔یوں واقعہ نگاری قاری کو اپنے محاصرے میں لے کر آگے بڑھتی ہے؟ تجسس کی فضا تخلیق کرنے پر بھی تمہیں ملکہ حاصل ہے۔اس عنصر نے مذکورہ کہانی میں

جان ڈال دی ہے۔ یہی وہ قصہ پن ہے جس سے دستبرداری نے اُردو افسانے کے قاری کو لکھاری سے ناراض کر دیا ہے اور تم اسے پرچا کر واپس لے آئے ہو..... لیکن اس معصوم قاری کو کیا خبر کہ تم اسے کس اجنبی وادی میں لے جانے والے ہو۔ یہاں کرداروں میں جس طرز کی قلب ماہیت کا جادو آزمایا گیا ہے وہ ایک حساس قاری کے لیے نیزوں کی انیوں پر برہنہ پا رقص ثابت ہوا ہے۔ اس اثناء میں وہ بے چارہ بھول جاتا ہے کہ مسیحا گری ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اس لیے کہ افسانے کی فضا، ماحول اور ٹریٹ منٹ ایک ایسی دنیا بنا چکے ہیں جس میں ارسلان اور ساجو اس طرح ایک دوسرے میں ٹرانسفر ہوئے ہیں کہ صرف اپنے متعلقین کے لیے ہی نہیں ہر قاری کے لیے کرب کی صلیبوں کی ایک داستان چھوڑ گئے ہیں۔ موضوع کی Novelty پر کلمہ تحسین تو وہ ادا کرے گا جس کے ہوش ٹھکانے رہیں گے۔ اس کہانی کی Nuisance کو ہضم کرنا ہی کافی دشوار ہے کہ پڑھنے والا سوچتا ہے، سماج میں پڑنے والی دراڑ کے اثرات کہاں تک جا سکتے ہیں؟ اس واقعے کی علامتی تعبیر پر تفصیل کے ساتھ پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ فی الوقت اتنا کہنا ہے کہ ہمیں کبھی اپنی بے چینیوں کو ٹٹولنا چاہیے۔ ہم میں سے کون پوش علاقے میں ایک بورژوا گھر میں پر تعیش زندگی گزار رہا ہے۔ جبکہ اس کا Basic Self کسی خانہ بدوش کی جھونپڑی میں پڑا ہے اور المیہ یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ تڑپ رہے ہیں۔ کہیں ہماری بے تابیاں مراجعت کے عمل کا تقاضا تو نہیں کر رہیں؟ اپنی اصل کی اور لوٹ جانے سے ہمیں سکون کی گم گشتہ فردوس اگر مل جائے تو کیا یہ خسارے کا سودا ہوگا؟ مگر رائج الوقت زمینی حقیقت کی صورت یہی دکھائی دیتی ہے کہ مفلسی کی خانہ بدوشی، تونگری کے مضبوط شہروں کی جانب اپنا رُخ موڑ چکی ہے۔ سب قلاشی سے عیاشی کی طرف پورے جوش کے ساتھ گامزن ہیں اور اپنے داخلی اضطرار میں پیہم اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ مگر پھر وہ سمے آ جاتا ہے جب مزید برداشت کی تاب نہیں رہتی اور لیر لیر وجود جھونپڑے کی شکستگی میں پناہ پا کر شانت ہو جانا چاہتا ہے۔ گویا اس کہانی کا دوسرا سرنامہ 'واپسی کا سفر' ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ارسلان اور ساجو دو کردار نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی کردار ہے جو ہر بے قرار روح کا مقدر ہے۔ ہر گھڑی دو متضاد احوال کی طرف اس کی مسافرت جاری رہتی ہے اسی لیے اسے کسی پل کل نصیب نہیں ہے۔ ہماری متخالف تمناؤں نے ہمیں سودائی کر دیا ہے۔ تمہارا افسانہ کہتا ہے ارسلان کو ساجو سے بالجبر ایک بار جدا کر دیا جائے اور پھر انہیں اپنے اپنے اصل Self کی آماجگاہ کے سپرد کر دیا جائے۔ یوں یہ عمل مضطرب روحوں کو قرار بخش دے گا۔ مگر انسان اپنے وجود کی تفرید کے باوصف جڑوں کی ایک مکمل انجینئرنگ رکھتا ہے۔ سو اس مہاجرت کو وابستگان کیسے ڈائجسٹ کریں گے؟

اس کہانی میں ذات کا Chaos بڑے مختلف اور منفرد انداز میں موضوع بنا ہے۔ جس کا لطیف تر پہلو یہ ہے کہ گڈمڈ ہونے کا عمل ذہنی ہے۔ ضروری نہیں کہ جسمانی سطح پر کوئی وقوعہ بروئے کار آئے۔ فرد بظاہر معمولات کی انجام دہی میں بسا اوقات بڑے ہی نارمل طریقے سے منہمک ہوتا ہے۔ مگر اس کے داخل میں ایک حشر سا برپا رہتا ہے اور پھر وہ طمانیت کے حصول کے لیے Quantum jump کے ساتھ ایک کیفیت سے دوسری کیفیت، ایک خیال سے دوسرے خیال، ایک عقیدے سے دوسرے عقیدے کی جانب ہجرت کر جاتا ہے۔ بیرونجات میں کسی نوع کا کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ وہ اپنے گھربار کے آرام، سہولت، سکون، فراوانی، رشتوں، اسباب..... سب کو ایک دم ترک کر کے کہیں اور کوچ کر جاتا ہے۔ اب اس کو روگی کہو، تیاگی کہو، جوگی کہو یا رمتا جوگی اسے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ رفاقتوں کے Net work سے نجات پا کر کسی ان دیکھے بیگانگی کے دشت میں اپنا گھر بنالیتا ہے۔ بات تو بس Live کرنے کی ہے، اگر کوئی Fantasy میں Live کر رہا ہے۔ اگر وہ Cloud land میں ''واقعتاً'' موجود ہے تو اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔ ہر مدفع شخص پر، ہر سوچنے والے، ہر غیر مطمئن، ہر نا آسودہ فرد پر یہ واردات بیتتی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ جسے صرف اپنا آپ عزیز ہوتا ہے وہ اپنے لیے گردو پیش کو چھوڑ دیتا ہے۔ جسے اوروں کا غم بھی اپنے جگر میں پالنے کا روگ لاحق ہو وہ ان کی خاطر کہیں اُوپر اُٹھ جاتا ہے۔ ہاں! وہ لوٹ کر ضرور آتا ہے اور اپنے دیکھے ہوئے خواب کو متشکل کر کے دکھا دیتا ہے۔ بہر طور دونوں انواع میں مشترک قدر ایک ہی ہے کہ یہ واردات سوچ کی دنیا میں برپا ہوتی ہے۔ ہاں معدودے چند خواب کے طلسم کو توڑ پاتے ہیں۔ باقی خواب میں جاگنے کے بعد بھی خواب میں رہتے ہیں۔ جہاں تک اس افسانے کی زبان یا اسلوب کا تعلق ہے تو اُردو کا محاورہ ہے۔ پارے کا قائم النار ہونا یعنی بوٹیوں کی وجہ سے پارے میں خاصیت پیدا ہو جانا کہ وہ آگ پر نہ اڑے بلکہ کشتہ ہو جائے۔ تو تم نے ماجرے کو بیان کرنے کے لیے وہ انداز نگارش چنا ہے جس نے افسانے کو پارے کا کشتہ بنا دیا ہے۔ تنقید کی آگ پر یہ اڑے گا نہیں۔

خوشبو کا ہم سفر

فرحت زاہد، لاہور

"تم ڈاکٹر کوثر سے ملیں"

انگلینڈ سے ایک شاعرہ دوست فون پر پوچھ رہی تھی۔

میں نے نفی میں جواب دیا تو بولی "حد ہوگئی یار تمھیں ایک سال ہوگیا لاہور میں، ابھی تک ڈاکٹر کوثر سے نہیں ملیں۔ یہ لو فون نمبر ابھی کال کرو۔"

میں ڈاکٹر کوثر کو فون تو نہ کرسکی مگر حسن اتفاق کہ چند روز بعد ہی ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہو گئی۔ تعارفی کارڈز کا تبادلہ ہوا اور اُس کے بعد شاعری کا۔

میں نے ڈاکٹر کوثر محمود کو ویسا ہی پایا جیسا کہ دوستوں سے ان کے بارے میں سن رکھا تھا۔ ایک نستعلیق اور شائستہ شخصیت، گفتگو اور انداز دونوں میں شاعری چھلک چھلک ایک کرشمہ ایک جادو۔

ان کی شاعری اور شخصیت اک دوسرے سے سو فیصد میچ کرتی ہیں۔ ورنہ اکثر شعراء کی شاعری پڑھنے کے بعد جیسا اُن سے ذاتی زندگی میں ملنا ہو تو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ ڈاکٹر کوثر کی شاعری کو پہلے پڑھ لیں یا اُن سے ملاقات پہلے ہو جائے۔

ایک خوشگوار تاثر بہر حال قائم رہتا ہے۔ خوشبو اپنا رنگ جماتی ہے۔ کوثر ہی کے بقول:

کون ہمیں اچھا لگتا ہے
اور کتنا اچھا لگتا ہے
اس کا فیصلہ پہلی نظر میں
ہم کو خبر ہونے سے پہلے
خوشبو خود ہی کر دیتی ہے

(خوشبو فیصلہ کرتی ہے)

شاعری کے علاوہ میوزک سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ مترجم ہیں، اُستاد ہیں، لوگوں کے دانتوں کو موتیوں مالا میں پرونا اور اُن کی مسکراہٹیں سنوارنا ان کا پیشہ ہے۔ میں چونکہ ان کی شخصیت کے اُن پہلوؤں سے زیادہ واقف نہیں اس لیے صرف شاعری کے حوالے سے بات کروں گی۔

روشنی، خوشبو، پھول اور تتلی ان کی شاعری کے مضبوط استعارے ہیں۔ مناظر فطرت اور کائنات میں پھیلا ہوا حسن بے پناہ شاعر کو نہال اور سرشار کیے ہوئے ہے۔ وہ یگوں کی خامشی کا بھید جاننا چاہتا ہے اور اُلوہی آئینوں میں اپنا عکس دکھلانے والے کے بارے میں متجسس ہے۔ وہ اپنی مجسم حیرتی آنکھوں سے حسن بیکراں کو تمام حسیات کے ساتھ جسم و جاں میں جذب کر لینا چاہتا ہے۔ مگر اُس کا نظریہ محبت کا عامیانہ نہیں بلکہ اس میں ایک سجاؤ ہے، قرینہ ہے۔

یہ شاعری اُس پاپولر شاعری کے زمرے میں نہیں آتی جو تو جوان لڑکے، لڑکیاں، بک سٹال سے خریدتے ہیں اور اپنے Taxt msg میں مصالحے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ شاعری تو بس درویش کی صدا ہے۔ دلی کا فیض ہے۔ کسی درگاہ پر دعاؤں کے بعد بٹنے والا پرشاد ہے جو ساری انسانیت کے لیے ہے۔

چلو اگلے برس
دربار صاحب کے بلاوے پر جو آیا تو
تمہارا شہر مگر بھی تمہارے ساتھ دیکھوں گا
کسی بھی شہر کو اپنا سمجھنے کے لیے
وہ منتظر آنکھیں ضروری ہیں۔

(پریت کور سے مکالمہ)

یہ شاعری سوال کرتی ہے۔ جنم سے دوسرے جنم اور اس یگ سے دوسرے یگ تک سوچنے والے ذہن کا پتہ دیتی ہے کہ آخر شودر اتنا نربھاگی کیوں ہے۔ کھشتری اتنا نراس کیوں ہے اور برہمن کو یہ ارفع منصب کس نے تفویض کیا ہے؟

نظم کی بات ہو تو یہاں انتخاب محال ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک مرصع نظم دل و نظر کو کھینچتی ہے۔ منقولہ نظم میں لکھی ہر ہر سطر ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے۔

اُسے کہنا
کہ دنیا بھر کی سب اچھائیاں
اک شخص میں یکجا نہیں ہوتیں
اُسے کہنا
کہ خوابوں کے جزیرے نکل آئے
اُسے کہنا
کسی کچے گھروندے میں بھی کھل کر
رات کی رانی کی نکہت کم نہیں ہوتی

اُسے کہنا
خزاں رُت میں شگوفے کھل نہیں سکتے
اُسے کہنا
کہ دریا کے کنارے مل نہیں سکتے
اُسے کہنا!
محبت اور خوشبو کے نصیبوں میں بکھرنا ہے
اسے کہنا!
یہ مشکل ہے
کسی افسردہ آنگن میں
کوئی جانِ غزل آئے
اُسے کہنا!
کہ خوابوں کے جزیروں سے نکل آئے

ڈاکٹر کوثر کی نظم میں ایک خاص رچاؤ اور پڑھنے کا رُجحان ہے۔ ان کا کینوس گلوبل اور موضوعات، انسان اور کائنات سے جڑے ہیں۔

کہتے ہیں Billingual ہونے سے ذہن کثیر الجہات ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم میں ہر Diversity دکھائی دیتی ہے۔

اس دھرتی کی ساری خوشیاں
اور سارے مصائب میرے ہیں
سب روشن روشن تہذیبیں، آثار و مذاہب
میرے ہیں۔
اس دھرتی پر رہنے والے
سب لوگ مرے ماں جائے ہیں
اور لاکھوں نوری سال پرے
سیار و ثوابت سے آگے
گر ہیں تو مرے ہمسائے ہیں
(نظم میرے بچے کے سکول کا ترانہ)

کچھ نظموں میں افسانوی رنگ موجود ہے۔

ایک نظم کا آغاز اور انجام دیکھیے۔

آغاز......عجب خوشبو بھرے دن تھے
ہم اپنے جسم کے ملبے سے
خوشبو کی طرح اُٹھے
انجام......جو اپنے جسم کے ملبے سے
خوشبو کی طرح اُٹھے
یہاں آرام کرتے ہیں
(رائیگانی......رشید امجد کے لیے)

ڈاکٹر صاحب کا تعلق چونکہ پوٹھوار سے ہے اس لیے قدرتی حسن سے مالا مال خوبصورت پہاڑی علاقوں پر ایسی نظمیں موجود ہیں جہاں مسافر نے قیام کیا اور پھر اُن لمحوں کو نظم کے پیکر میں ڈھال کر لازوال کر دیا۔ مثلاً کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو، ریت، پوٹھوار سید پور اور کابل۔ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر کوثر کی نظمیں ان کی غزلوں پر بھاری ہیں اور ان کا مزاج نظم سے قریب تر ہے۔ مگر ان کی غزلیہ شاعری بھی کسی طرح عصر حاضر کی جدید شاعری سے کم نہیں۔

چند اشعار:

اب ذرا تفصیل سے اے قاصد خوش رو بتا
اُس نے پہلے کیا کہا، پھر کیا کہا، پھر کیا کہا

خواب کی طرح تجھے آنکھ میں بھر لایا ہوں
ایک خوشبو کی طرح ہاتھ نہ آنے والے

....

ہجر میں رات، انتظار میں دن
دے دیا تیرے اختیار میں دن

....

عمر بھر کا خسارہ نکلا ہے
کس نے رکھا تھا جیت ہار میں دن

....

• تجھ سے ملے تو چھپتے رہے دیر تک ہمیں
کچھ اجنبی خطوط ترے خدوخال میں

....

لگتا ہے ایسے اب اُسے جانا کہیں نہیں
خوشبو کو ہے قرار تیرے کنج لب کے پاس

....

اگر اس شاعری کے دریا کو کوزے میں بند کرنا ہو تو فقط یہ نظم کافی ہے

کوئی خوشبو نہیں
کوئی شکل نہیں
کوئی نام نہیں
ہم صحن چمن میں ایسے کھلے
ہمیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا
ہم جیتے رہے، ہم مرتے رہے
ہمیں سوچنے والا کوئی نہ تھا
اس دنیا کے مے خانے میں
کوئی ذکر ہمارا کیوں کرتا
ہم بادہ و جام کے لوگ نہ تھے
ہم یاد تمہیں کیسے رہتے
ہم منظر عام کے لوگ نہ تھے۔

''ہم منظر عام کے لوگ نہ تھے''

ایک ایسی پنچ لائن ہے جو شاعر کے مزاج اور ادبی رویوں کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ وہ ایک سچے تخلیق کار کی طرح مشاعروں کی ہاہاکار سے دور اپنی ذات کے Cocoom میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اب یہ کام اس ریشم کو تلاش کرنے والوں کا ہے کہ وہ اس Cocoom تک کس طرح رسائی حاصل کرتے ہیں۔

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ازرشِ سخن کوثر
ہے عکس چشم تلطف میں خال خال تیرا

احمد فراز اور دردِ آشوب

ڈاکٹر نزہت عباسی/کراچی

بیسویں صدی کی دنیائے شاعری کے افق پر طلوع ہونے والا ستارہ بالآخر اکیسویں صدی میں غروب ہو گیا۔ مگر اپنے پیچھے پوری کہکشاں چھوڑ گیا یعنی اپنی نظموں، غزلوں اور شعروں کے ذریعے ہمیشہ دنیائے ادب میں زندہ رہے گا۔

''کیونکہ انسان مر جاتا ہے لیکن اس کا فن زندہ رہتا ہے''

اور احمد فراز ہمیشہ دلوں میں زندہ رہیں گے۔ کیونکہ ان کی شاعری محض لفظوں کی کتابی شاعری نہیں تھی بلکہ جذبوں کی طرح دل میں اتر جانے اور ہونٹوں پر نغموں کی صورت میں ترنم ریز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

دردِ آشوب، تنہا تنہا، نایافت، شب خون، جاناں جاناں، میرے خواب ریزہ ریزہ، نابینا شہر میں آئینہ وغیرہ کی صورت میں وہ ہمیشہ اردو شاعری میں اپنے مقام پر فائز رہیں گے۔ اپنے تخلص ''فراز'' کی طرح انہوں نے شہرت و مقبولیت کی بلندیوں کو چھو لیا اور یہ مقبولیت انہیں اپنے منفرد اسلوب اور جدید فکر کی وجہ سے ملی۔ جو روایت اور جدت سے آمیز ہے۔ جس میں اردو کی کلاسیکی شاعری کا سارا رس موجود ہے اور نئے عہد کی ساری توانائیاں بھی شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری شعور موجود ہے اور یہ شعور سیاسی، سماجی اور اخلاقی زندگی کے مطالعے اور مشاہدے سے ابھرا ہے۔ ان کی غزلوں کا مزاج دھیما اور نرم ہے۔ جمالیاتی اور رومانی طرز نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے منفرد لہجے میں نہ صرف غمِ جاناں بلکہ غمِ دوراں کا بھی جمالیاتی اظہار کرتے ہیں۔

احمد فراز کی شاعری کا آغاز ایک پُر آشوب دور میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک، برصغیر کی تقسیم، قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات، جمہوریت کی پامالی، مارشل لاء کا نفاذ، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، معاشی عدم مساوات، طبقاتی کشمکش، مذہبی منافرت وغیرہ جیسے موضوعات و مسائل میں احمد فراز نے اپنے منفرد لہجے اور اسلوب سے اپنی علیحدہ شناخت قائم کی۔ ان کا انقلابی اور مزاحمتی لہجہ ابتدائے شاعری سے لے کر اختتام تک کارفرما رہا۔ انہوں نے قلم کو ہتھیار بنایا اور اس کی کاٹ سے سنگین دلوں میں اتر گئے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے ایک نئی تاریخ رقم کر گئے ہیں۔

''دردِ آشوب'' جو کہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے، پہلی محبت کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے قرب اور شدت کو انسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ ''دردِ آشوب'' میں ایک ہمہ جہت شاعر ایک تخلیقی فنکار اپنے پورے جیتے جاگتے شعور اور احساس کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ وہ اپنی پہلی آواز ہی میں سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتا ہے۔ اس آواز میں درد اور احساس کی شدت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سچ ہے، حق ہے، صداقت ہے اسی لیے اس میں اثر ہے معنویت ہے۔ درد کے ہر احساس کو چاہے ہو اپنا ہو یا پرایا احمد فراز نے شدت سے محسوس کیا اور اسے اس طرح لفظوں میں ڈھالا ہے کہ جس نے بھی اسے سنا، پڑھا اسے اپنا ہی درد لگا۔ یہ دردِ یہ آشوب ہر شخص کا درد ہے، دل کا نوحہ ہے، آنکھ کا آنسو ہے۔

اس مجموعے میں شامل ہر غزل اور ہر نظم ان کے زندگی کے گہرے تجربات کی عکاس ہے۔ زمانے کی تلخیوں اور سختیوں نے فراز کو ایسا فنکار بنا دیا جو درد اور کرب کی بھٹی میں تپ کر کوئلہ نہیں بلکہ ہیرا بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر کی آگ باہر کی آگ سے بہت تیز ہوتی ہے۔

تم نے فراز اس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی کیا پایا ہے
وہ بھی تو ناکامِ وفا تھے جو غالب اور میر بنے

درد کے احساس میں ڈوبے ہوئے اشعار میں نہ صرف لفظوں کی بازی گری اور صنعت گری نہیں بلکہ حقیقی جذبات کا اظہار ہے۔ شاعر کی رومانی فطرت ہر جگہ اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ اپنی ایک نظم ''مجھ سے پہلے'' میں یوں گویا ہیں۔

میں نے مانا کہ وہ بیگانۂ پیمانِ وفا
کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں
شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دکھ نہ رُلائے تجھے تنہائی میں

تنہائی کا احساس روح کو بالیدگی بخشتا ہے۔ انسان خود اپنا محاسبہ کرتا ہے۔ خود سے باتیں کرنے لگتا ہے اور خود کلامی کی یہ کیفیت احمد فراز کو کہنے پر مجبور کرتی کہ:

رہنے دو یہ پند و نصیحت ہم بھی فراز سے واقف ہیں
جس نے خود سو زخم سہے ہوں اس کو کیا سمجھاؤ گے

اپنی تنہائی اور درد کی کیفیت کو ایک نظم ''کوئی بھٹکتا بادل'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

دور ایک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہوئی بستی کی طرف آئے گا

نئی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وہ وقت کی مانند گزر جائے گا
جانے کس سوچ میں کھو جائے گی دل کی دنیا
جانے کیا کیا مجھے بیتا ہوا یاد آئے گا

وہ اپنی جذباتی کیفیت اور منطقی رجحان کو باہم آمیز کردیتے ہیں۔ یہ بہت کم شعراء کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ انہوں نے بہت نفاست، سلیقے، عمدگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ قدیم اور جدید دونوں اسالیب سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنی اختراعی قوت سے اس میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی کئی مشہور غزلیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

احمد فراز کے ہاں استعارات، تراکیب، تشبیہات اور علامات کے شاعرانہ وسائل کا بھی خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔ جو ان کی جدید طرز فکر کے غماز ہیں۔

ذکر اس غیرت مریم کا جب آتا ہے
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

''درد آشوب'' میں شامل دیگر نظمیں احمد فراز کے نظریات اور خیالات کی ترجمان ہیں۔ جو عالمی اور ملکی سطح پر ان کی گہری بصیرت کا بھی اظہار ہیں۔

''غریب شہر کے نام''، ''اے میرے بے درد شہر''، ''شہدائے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نام''، ''افریشیائی ادیبوں کے نام''۔

ان کی عصری حسیت کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔

جکارتہ و سراندیب سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ سبھی کی ایک صلیب
ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے

احمد فراز نے اپنے عہد کے ذہنی اور جذباتی رویوں کو سمجھا ہے۔ اور اپنے دور کی زندگی کا بغور مشاہدہ بھی کیا ہے۔ جس نے اس کی شاعری کو عالمی اور آفاقی بنادیا۔

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

کویت میں مقیم اُردو اور پنجابی کے معروف شاعر
ناز اوکاڑوی کے پنجابی شعری مجموعے
ڈوہنگے پانی
کا دوسرا ایڈیشن طباعت کے آخری مراحل میں ہے
صفحات: 144 قیمت: 200 روپے
ملنے کا پتہ:
نستعلیق مطبوعات
F-3 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

خیالوں میں ہے روشن سبز گنبد میں گھر بیٹھے زیارت کر رہا ہوں
ساہیوال میں مقیم نعت اور غزل کے معروف شاعر علی رضا کا نعتیہ مجموعہ
ثنائے سرور ﷺ
ڈاکٹر خورشید رضوی، احسان اکبر اور خالد علیم کی آراء کے ساتھ
نہایت دیدہ زیب گیٹ اپ میں شائع ہوگیا ہے
صفحات: 128 ملنے کا پتہ: قیمت: 200 روپے
نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 042-7351963

اب تمہیں سوچنے نہیں دوں گی تم اسی وقت میرے ساتھ چلو
دوحہ (قطر) میں مقیم معروف شاعرہ فرزانہ صفدر کا پہلا شعری مجموعہ
''مگر پھر بھی......''
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے
صفحات: 128 ملنے کا پتہ: قیمت: 200 روپے
نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 042-7351963

”خود سے اجنبی“ اور نوجوان شاعر غضنفر عباس

خورشید بیگ میلسوی

ن۔م راشد نے گماں کا ممکن لکھ کے نظم میں فکری زرخیزی کا جو آغاز کیا تھا اس وقت شاعری کے اعلیٰ مقام پر بیٹھ کر انہوں نے تو کلاسیکیت کا جو باب وا کیا لفظ اور غنا کے ذریعے قاری کے مزاج تک موثر رسائی کی اس وقت عین ممکن ہے انہوں نے سوچا ہو کہ ان کی یہ فکری بلندی کسی پہلو سے غالب کی شہرت کی طرح ان کے بعد سامنے آئے گی۔ دیکھا جائے تو گماں کا ممکن اور خود سے اجنبی کے ترکیب ساز فطرت میں موجود یکتائی کی مماثلت کی سطح پر کھڑے ہیں۔ گماں تھا کہ وہ میرا دشمن ہوگا لیکن یہ تو ممکن ہو گیا کم از کم میں خود کو تو جانتا ہوں۔ یہ کیا کہ میری ذات مجھ سے اجنبی ہو چکی ہے۔ دونوں تراکیب کے حوالے سے مذکورہ اظہار یہ ہمیں کم از کم اس نقطے پر متفق کرنے کے امکانات رکھتا ہے کہ غضنفر عباس اپنے وجود کے باہر موجود غنا اور تراکیب کو اس انداز سے جوڑتا ہے کہ ذات کا عکس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں نظر آئے۔ کہتے ہیں جب عشق ہوتا ہے تو انسان اپنی ذات کو فنا کر کے شیخ یا محبوب کی ذات میں چلا جاتا ہے اور ایسا تب ہوتا ہے جب اس کے اندر منزل تک پہنچنے کی طاقت نہیں رہتی۔ جس طرح پھول ٹہنی پر اگتے وقت پت جھڑ سے آگاہ نہیں ہوتا اور شبنم دُھلا پاکیزہ پھول اس احساس سے عاری ہوتا ہے کہ باغبان کی بجائے گلچیں بھی آ سکتا ہے۔ اس کو جناب احمد ندیم قاسمی نے ایک خوبصورت ترکیب میں بیان کیا ہے اور وہ ترکیب ہے بیگانۂ احساسِ جمال وہ کہتے ہیں:

حسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
پھول کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں

مغائرت، بیگانگی کے دھندلکے یہ بھی نہیں کہ انسان پیرہن معنی سے خالی اور عریاں ہے یا اس نے مفہوم کی کرنڈی نہیں پہنی ہوئی جو چیز کی آئینہ دار ہے وہ اس کا لباس ہے۔ اسی طرح غضنفر عباس خود سے اجنبی ہو کر کہیں درمیان والی کیفیت میں آ جاتا ہے جہاں وہ خود سے بیگانہ بھی اور مانوسیت کی سرحد سے زیادہ دور بھی نہیں اور یہی اس کا کمال ہے کہ وہ عارف والا جیسے مضافات میں رہ کر ادب کے اعلیٰ ایوانوں میں اپنی نظموں کے ذریعے پہچانا جا رہا ہے۔ مثلاً ان کی نظم مجھے ”ایک گھونٹ پانی دے“ کا یہ اقتباس دیکھیے:

وفورِ تشنگی

پامال کرتی ساعتوں کی بے کرانی
ڈگمگاتے راستوں کے گرد پچھلی منزلوں کی اوٹ میں
چھپ کر
بلاتی منزلوں اور منزلوں کی حشر سامانی
مرے ہاتھوں میں خالی جام اور اس جام کی تہہ میں
ترے ہونٹوں کی جھلمل...... ایک بوسہ...... ایک دریا
کی روانی

ہونٹوں کی جھلمل اس اقتباس میں ایک خوبصورت فنی ترکیب ہے جھلمل عکس رنگیں کو کہتے ہیں سماجی حسن کے اس معاملے میں یہ بات بڑی حسیاتی ہے کہ محبوب کے لبوں کا عکس بھی خمار دے رہا ہے جو جام کی تہہ میں موجود ہے۔ جام کی تہہ اس لیے کہ وہاں عکس بننے کی گنجائش ہے اور فرقت میں وصل کا شائبہ محض ایک تخلیقی جمال ہی نہیں بلکہ گمان کا ممکن ہے اور یوں معاشرے کی جبریت میں عشق کا چراغ روشن ہو جاتا ہے۔ یہاں دریا کی روانی بظاہر آنسوؤں کی ترجمانی ہے لیکن اس میں رجعیت، ایمائیت اور اُمید کا پہلو موجود نظر آتا ہے۔ بنتی چاندنی رُت نظم کا مافی الضمیر دراصل ہمارے اندر کے جذبوں کی ٹوٹ پھوٹ کا وہ عکس ہے جو ہمارے معاشرے میں اور کائنات میں انفرادی یا اجتماعی سطح پر نظر آ رہا ہے۔ یقیناً مرکزِ محبت سے پھوٹنے والی کائناتی خوش رنگ اقدار کے حوالے سے انسان کے باطن کو حسین بنائے تو اس کا ظاہر بھی صاف اور شفاف اُجلا نظر آئے۔ خالد احمد کہتے ہیں:

اس پہ غازے کا حاشیہ بھی نہ تھا
وہ بدن ایسا کھوکھلا بھی نہ تھا

تو بظاہر یہ شعر اس جمالیاتی پہلوئے کائنات کو ہویدا کرتا ہے لیکن دراصل یہ ہماری مصنوعی زندگی کو تسلیم کر لینے اور مصنوعی زیبائش کا حقیقی حسن بڑھانے کے رویے کا ناقد بھی ہے۔ یہ اس سچ کی طرح ہے جو ہمارے شاعر غضنفر عباس کے دل میں ہے لیکن یہ سچ جھوٹ میں کیوں بدل رہا ہے۔ یہ چاندنی کے رنگوں کے اُڑنے، اس کے جنونی ہو جانے اور فطرت کی حدوں سے دور نکل جانے کی لایعنیت کا اظہار ہے۔ گویا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں جتنا بھی حسن ہے وہ ہمارے اخلاقی و باطنی حسن کا عکس ہے اور جتنی بھی بدصورتی ہے اس میں فطرت یا کائنات کا قصور ہے یہ ساری بدصورتی ہمارے اندر کے سفاک اور بے حس وجود کا شاخسانہ ہے کچھ لائنیں دیکھیے:

مسلسل کف اُگلتی ہے
بگولے گردبادوں کے ہراول لشکری بن کر
بدن تاراج کرتے ہیں

تو پتہ چلتا ہے کہ کائنات اور اس کے اندر پیدا ہونے والے جغرافیائی عناصر وجود رکھتے ہیں۔ انہیں جیسا انسانی رویہ تربیت دیتا ہے ویسے وہ خون آشام بن جاتے ہیں لیکن ہم یہ سمجھیں کہ وہ صرف مایوسی کا شاعر ہے تو اگر چہ یہ کچھ غلط بھی نہیں ہوگا لیکن وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو مایوسی کو ابدیت کے رنگ میں نہیں بدلنا چاہتے۔ وہ اس میں خیر کا پہلو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ''ہماری سمت مت دیکھو'' میں وہ بیان کرتے ہیں کہ انسان ایک ایسی لاش میں بدل چکا ہے جس پر کوئی رونے والا نہیں۔ سورج کے پجاری'' نظم میں وہ بتا رہے ہیں کہ ہمارے ہاں صرف خاموشی کا شور ہے گویا ہمارے ہاں احساسات کے معنی بدل چکے ہیں۔ ہمارا خوف اخلاقیات سے عاری اور ہماری جنگ فساد بن چکی ہے۔ ہم اُلٹے قدموں چل رہے ہیں۔ ہم کائنات کی بربادی کا باعث بن رہے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی معرفت حاصل ہوگئی تو ہم عروج تک پہنچ سکتے ہیں ''یوں سفر جاری رہے گا'' اپنی نظم میں وہ کائنات کے آغاز سے لے کر آج تک کے سچے حوالوں سے اپنے اندر جو سچائی اور روشنی محسوس کرتے ہیں وہ ان کا بلند بانگ اظہار کرتا ہے۔ یہ صدا اُمید کی وہ لو ہے جو اس بے معنویت کو مفہوم عطا کر سکتی ہے۔

یوں نظم کے حوالے سے غضنفر عباس اُردو ادب کے اہم شاعر ہیں جو نظم کے ارتقاء میں انسانی عظمت سے بیگانگی سے نقاد بن کر انسانی وجود کو رمز سے قریب کر رہے ہیں اسی لیے ڈاکٹر ابرار کہتے ہیں کہ ہر دور میں اچھے شعراء اچھی خاصی تعداد میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ اصل بات تو اس سطح سے اوپر اُٹھ کر غیر معمولی صلاحیت اور انفرادیت کا حصول ہے اور غضنفر عباس بطور شاعر اسی جانب پیش قدمی کرتا دکھائی دیتا ہے۔

آج رکھا ہے میرے غم کا بھرم برسات نے ۔۔۔ کر دیا اس حال میں مجھ پر کرم برسات نے
یوں چھپایا ہے ملال چشم نم برسات نے ۔۔۔ میرے آنسو ہو گئے ہیں تیز بوندوں میں ہی ضم

اٹلی میں مقیم معروف شاعرہ شازیہ نورین کا دوسرا شعری مجموعہ

''سکوتِ حرف''

مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہوگیا ہے

صفحات: 160 ۔۔۔ ملنے کا پتہ: ۔۔۔ قیمت: 300روپے

نستعلیق مطبوعات F-3فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 0331-4489310 042-7351963

گجرات میں مقیم نوجوان شاعرہ شمائلہ اعوان کا پہلا شعری مجموعہ

''ہو گئے ہیں اجنبی'' شائع ہوگیا ہے

صفحات: 128 ۔۔۔ ملنے کا پتہ: ۔۔۔ قیمت: 200روپے

نستعلیق مطبوعات F-3فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 0331-4489310 042-7351963

ڈاکٹر مرتضیٰ ساجد کا "لمحوں کے گرداب"

مظہر بخاری

روزِ اوّل سے شاعری احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ تسلیم کی جاتی ہے۔ اچھی شاعری خوشبو کی طرح ہوتی ہے جو خود بہ خود ہمارے روح و بدن میں سرایت کر جاتی ہے اور دھیرے دھیرے ہمارے وجود کو گدگدانے لگتی ہے۔ جس سے انسان ایک ایسی فضا میں چلا جاتا ہے جہاں کائنات کے سربستہ راز کھلنے لگتے ہیں۔ شاعری غم، خوشی، ہجر و فراق، خوف، بھوک، عسرت، مسرت، معاشرتی ناہمواری، حزن و ملال، حسرت و یاس اور ناانصافی جیسے لاتعداد اندوہناک مسائل سے آمیخت ہے جس کی حقیقت سے کوئی بھی ذی شعور انکاری نہیں۔

ڈاکٹر مرتضیٰ ساجد سے پہلی ملاقات میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کل وقتی شاعر ہے۔ اُس کے اندر محبت کرنے والا انسان، تعلق نبھانے والا دوست اور دوستوں کی خاطر پریشانیاں اُٹھانے والا حساس اور دردمند دل رکھنے والا پرخلوص شاعر موجود ہے۔ اس کا شعری مجموعہ "لمحوں کے گرداب" ایسے ہی افکار و خیالات کا ترجمان ہے۔ میں نے ڈاکٹر مرتضیٰ ساجد کو ماضی کی تلخیوں، حال کے اذیت ناک موسموں اور مستقبل کے سندر خواب بنتے ہوئے پرعزم پایا ہے۔ اس کی شاعری میں سراسیمگی ہے، خوف ہے، دہشت ہے۔ یہ خوف اُس کے اندر کیوں در آیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ معاشرے کی حالت سے آگاہ ہے لوٹ مار، اقربا پروری، ظلم و زیادتی کی فضا میں انسانیت شرمندہ نظر آتی ہے۔ یہ خوف دراصل باہر کا خوف ہے۔ اُن لوگوں کے لیے ہے جو اس کے ساتھ رہتے ہیں لیکن سہمے سہمے، خوف زدہ جن کے چہروں پر صدیوں سے مسکراہٹ کی چھینٹ تک نہیں آئی۔

کوئی بھی آرزو اپنی جوانی تک نہیں پہنچی
ہماری ہر تمنا ہے مسلسل خوف کی زد میں
کیسی اندھیر نگری میں بستا ہوں اے خدا
ہر سمت تیرگی ہے ضیائیں نہیں رہیں

وہ ایک ایسے سماج کا حصہ ہے جہاں ہر وقت ماحول دگرگوں ہونے کا اندیشہ رہتا ہے:

سہمے ہوئے خوف سے، گلیاں اُداس ہیں
بچوں کے پاس جس طرح مائیں نہیں رہیں

جیسے جیسے ہم لمحوں کے گرداب میں گم ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے اُس کے احساسات کھلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ دیارِ عشق کی آب و ہوا سے گریز پا دھوپ سے لپٹ کر زندہ خیال دھڑکتی دعاؤں کی تکمیل کا آرزومند ہے۔ اُسے تلخ لمحوں کی سلگتی بستیاں رات دن جینے کا حوصلہ دیتی ہیں تو اُس کے تصور میں گلاب مہکنے لگتے ہیں۔ وہ ناصر کاظمی کی طرح رات دن رُسوا کرنے والوں کی بابت سوچتا ہے جن کی یادیں اُس کا کل اثاثہ ہیں۔ یہ اور بات اُس کی انا کا دائرہ سلامت ہے۔

اُس کی شاعری پڑھ کر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دیگر شعراء کی طرح اُس کی زندگی میں آسودگی کا کوئی لمحہ نہیں۔ کاندھوں پر نام و نسب کا تکبیر اجنبی آئینوں میں بانجھ تقدیر کا روگ بنا ہوا ہے۔ وہ اپنی چاہتوں کے نگر کی تلاش میں محوِ سفر ہے۔ وہ بخت کی بیداری سے عاجز گہری سوچوں میں گہری تاریکی میں بدن اُتار کے سکھ کی نیند سونے کا آرزومند ہے۔ شاید تیز دھار لمحوں کے رنج بادلوں کے روح افزا پانی کی تاثیر پالے اور غار کا کج فہم آدمی غار سے اُکتا جائے۔ زندگی سزا ہونے سے بچ جائے۔

اگرچہ لہو پیتا ہے یہ لمحہ بہ لمحہ
یہ جینا بھی سزا لگتا ہے جاں کو

اُس کا خانہ بدوش دل عافیت کی تلاش میں اطمینان کی ردا تلاش کر رہا ہے جسے اوڑھ کر وہ آسودہ حال ہو جائے۔ وہ حیات کو پانی کے بجائے لہو سے باوضو کر کے خواہشوں کی ترسیل کا دفتر کھولے خوابوں کی تعبیرِ وفا کا منتظر ہے:

خانہ بدوش رستوں کے ہمراہ رات بھر
میں تجھ کو ڈھونڈتا ہوں کہیں تیرا در نہیں
نظر سے خوابوں کی وادیوں تک ہر ایک منظر بدل رہا ہے
تری جدائی نے زندگی کے سفر کو یکسر بدل دیا ہے

سوگوار فضا میں چیختے سناٹے، اجنبی سخن، چاہتوں کا خمار لیے اُس کی روح کو بے قرار رکھتے ہیں۔ منافقین کے رویوں نے رنجشیں بڑھا دی ہیں۔ خود کو خود کے خلاف دیکھ کر اضطراری جانکسل بن گئی ہے اور وہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ

خود اپنے آپ سے اک شخص ہو رہا ہے جدا
ترے خیال کی سرحد کو پار کرتے ہوئے
وہ جس کی یاد کی خوشبو سے دل مہکتا ہے
وہ جا رہا ہے مجھے سوگوار کرتے ہوئے

وہ کبھی جنگ آزما ہوتا ہے تو کبھی مصلحت کوش،

کہیں بدخو کے لیے ہاتھ اور بازو تراشتا ہے، کہیں انا کو فرار کی راہ دکھاتا ہے۔ مجھے اس کے ہاں زندگی سے ہم کلام ہونے کے سو رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ حاکم وقت کو للکارنے کا عزم بھی رکھتا ہے اور اُس کی ظالمانہ چیرہ دستیوں پر نوحہ پڑھنے کا حوصلہ بھی۔ یہ اور بات ہوس زر کی ماری دنیا اُلجھن زدہ سازشی عناصر کی گونج اُس کے روح و بدن کو لرزہ براندام رکھتے ہیں۔ ان سب کے باوجود اُس کا آہنی ارادہ دیدنی ہے۔

جسم مر جاتے ہیں لیکن جستجو مرتی نہیں

روح میں اک جستجو کا مرحلہ قائم رہا

اس کی حمد، نعت، سلام، غزل اور نظم اُس کے بہترین ذوق سلیم ہونے کی آئینہ دار ہے۔ وہ میر ہے نا غالب، اقبال ہے نہ فیض لیکن اُس کی شاعری پڑھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ڈاکٹر مرتضٰی ساجد ہے۔ وہی ڈاکٹر مرتضٰی ساجد جس میں محبت ہے وفا ہے اور سب سے بڑھ کر انسانیت۔ حالاتِ حاضرہ کے خوف اُسے دہشت زدہ کرتے کرتے خود دہشت زدہ ہو گئے ہیں۔ اُس کی طبیعت میں ٹھہراؤ نے اُسے ہر میدان میں ثابت و سالم رکھا ہے۔ میں اُسے اس قدر توانا شعری مجموعہ کی تخلیق پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے عرض گزار ہوں:

جانے لگا تو عہد ہنر چھوڑ جاؤں گا

اپنے لیے میں اُجلا سفر چھوڑ جاؤں گا

اُردو کی طرح اُس کی پنجابی شعری کتاب "جنے وچ تریڑاں" کی شاعری میں پنجاب کی ثقافت، میلے محبتیں اور دیہات کی پرفضا زندگی کے دلکش رنگ اور سماج میں پھیلے ہوئے دکھ سب دل کی آواز بنے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر مرتضٰی ساجد خوش رہو۔ شاد رہو۔ آباد رہو۔

معروف شاعر، کالم نویس، مترجم اور سفرنامہ نگار

عامر بن علی

کی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہوگئے ہیں

❀ محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ) / قیمت: 130 روپے ❀ چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ) / قیمت: 130 روپے

❀ سرگوشیاں (شعری مجموعہ) / قیمت: 180 روپے ❀ یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ) / قیمت: 150 روپے

❀ محبت کے دو رنگ مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہ راست اُردو میں کیے گئے تراجم) / قیمت: 150 روپے

❀ آج کا جاپان (سفرنامہ) / قیمت: 300 روپے ❀ گفتگو (انٹرویوز) / قیمت: 400 روپے ❀ مکتوب جاپان (کالمز) / قیمت: 400 روپے

معروف شاعر، مزاح نگار، کالم نویس، کمپیئر اور ریڈیو پروڈیوسر

ابرار ندیم

کی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہوگئے ہیں

❀ کون والاں دیاں جانے (پنجابی شعری مجموعہ) / قیمت: 200 روپے

❀ اب بھی پھول کھلتے ہیں (شعری مجموعہ) / قیمت: 200 روپے

❀ چلتے چلتے (کالمز) / قیمت: 300 روپے

منفرد لہجے کی ممتاز شاعرہ اور کالم نگار ڈاکٹر صغریٰ صدف

شبنم لطیف

اپنا سکے اُسے نہ کبھی دل کی بات کی
یہ زندگانی ہم نے بسر جس کے سات کی
اُتری ہوئی ہے رات مقدر کے شہر میں
بے رنگ ہو چلی ہے دھنک میرے ہات میں
لگتا ہے تیری آنکھ ہے میرے وجود میں
رکھتی ہے جو خبر مری اک ایک بات میں

قصے کہانیوں کے دامن سے شعرا کے بیاضوں کے آنگن تک، خیالوں کی کہکشاں سے گفتگو کے بیانوں تک، ضوفشاں عورت جو ایک لاجواب نعمت بھی ہے اور جواب طلب سوال بھی۔ جو بیک وقت دستِ دعا بھی ہے اور سراپا طلب بھی۔ جو زبان پر بھی ہے اور بے زبان بھی، جو پوجا گھروں کی زینت بھی ہے اور بالا خانوں کی ذلت بھی۔ جو تخلیق کی حاکم بھی ہے اور مخلوق کی باندی بھی۔

زیادہ دنوں کی بات نہیں جب عورتوں میں اپنے حقوق اور مساوات کا احساس جاگا اور اس نے سماجی وسیاسی اور ادبی سطح پر جس طرح سے اپنی حیثیت تسلیم کرائی ہے اس نے ادباء وشعراء کے طرزِ احساس میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ نیا احساس اپنی خوشبو، عصری حیثیت اور سماجی آگہی سے کشید کرتا ہے۔ اس کا انطباق اردو ترقی پسند ادبی تحریک کے بعد سے ادب پر خصوصاً شعوری طور پر برتے جانے کی وجہ سے کیا جا سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں جن خواتین شاعرات نے بہت کم عرصے میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے ان میں پروین شاکر، شبنم شکیل، ثمینہ راجہ، ڈاکٹر شہناز مزمل، صوفیہ بیدار، ادا جعفری، فاخرہ بتول، عائشہ مسعود ملک، شازیہ نورین، ڈاکٹر فوزیہ تبسم، شاہدہ دلاور شاہ اور نوشی گیلانی قابلِ ذکر ہیں۔

اردو ادب کا ایک معتبر اور نمایاں نام ڈاکٹر صغریٰ صدف بھی ہے۔ وہ روایت کا پختہ شعور رکھنے والی عہدِ حاضر کی تازہ فکر شاعرہ ہونے کے علاوہ نئے آنے والوں کے لیے اک معمار کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی نمایاں ترین شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کی کالم نگار، محقق اور ممتاز دانشور بھی ہیں۔

ان کے ہاں مغربی رجحانات کے ساتھ ساتھ عصری اور سماجی شعور بھی پایا جاتا ہے۔ اُردو ادب سے ان کا تعلق خاطر ذہنی وجذباتی وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ ان کی شاہکار تصنیفات میں شامل ہیں۔

زندگی کے تمام دکھوں مصیبتوں اور اذیتوں کو بلند اور عظیم آدرش دور کرنے کی داعیا ہیں۔ اپنی تحریروں کے ذریعے دورِ حاضر کے انسان کے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور فکری مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ ان کے فکر وفن کا سفر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔ وہ انسانی تجربات وجذبات کے نئے امکانات کی تلاش میں محوِ سفر ہیں۔ ان کی شاعری کا بیج ان کھلے پھولوں کی طرح پوتر اور اپنی تمام ندرتوں نگہتوں اور بے نظیر جذبوں کا عکاس بھی ہے اور اسی دشتِ بے کراں میں اپنی محرومیوں، تنہائیوں اور آبلہ پائی کا بھی۔ ان کے باطن میں ان کی شاعری کی آگہی اور خود کلامی کا ایک ایسا شہر آباد ہے جن کی روشنیاں رات کی تاریکی میں خراماں خراماں ان کے ذہن کے کھلے دریچوں سے پھوٹتی رہتی ہیں جس سے ان کے ظاہر کو جلا ملتی ہے۔

اُلجھی ہوئی سی پھرتی ہے کچھ دن سے یہ ہوا
دیکھی ہے وحشت اس نے ابھی ایک رات کی
جس کی رضا کو اپنی رضا جانتی رہی
اس نے نفی ہی کی ہے صدف میری ذات کی

ساری زندگی فروغِ ادب کے لیے وقف کرنے والی ڈاکٹر صغریٰ صدف نے اپنی انا کو کسی قسم کی مصلحت کے سرد خانے میں ٹھٹھرنے نہیں دیا اور نہ رائیگاں شہرت کے حصول کے لیے اپنے فکر کا کشکول اُٹھایا ہے۔ نامور کالم نگار، شاعر وادیب ندیم اسلم نے ڈاکٹر صغریٰ صدف کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

''ڈاکٹر صغریٰ صدف کی شاعری خالص انسانی جذبوں کی خوشبو سے رچی بسی ہے۔ وہ نہ تو فلسفہ ومنطق کے بے آب وگیاہ صحراؤں کی مسافر

آہ ایف ڈی مخمور!

عطاء الحق قاسمی

بے ضمیر حلقوں میں یہ خبر بہت دکھ اور رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ جناب ایف ڈی مخمور گزشتہ شب قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے جناب ایف ڈی مخمور گزشتہ تمام حکومتوں کے غیر سرکاری پی آر او کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس کا صلہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر پاتے رہے۔ وہ خود کو پی آر او کہنے کی بجائے لابئسٹ (Lobbyist) کہلانا پسند کرتے تھے۔ مرحوم اگر چہ تمام عمر حکومتوں کے کاسہ لیس رہے تاہم وہ اندر سے ایک زبردست انقلابی تھے چنانچہ وہ بڑے سائنسی انداز میں حکمرانوں کے خلاف کام کرتے جن سے سرکاری اور غیر سرکاری طور پر بھاری رقمیں وصول کرتے تھے۔ میری ان سے ملاقات اکثر لاہور کے ٹی ہاؤس میں ہوا کرتی تھی۔ ان کی آمد کا پتہ کسی زوردار طمانچے کی گونج سے چلتا تھا کیونکہ مے نوشی کے بعد جب تک وہ کسی سے مار نہ کھاتے تھے ان کا نشہ پورا نہیں ہوتا تھا چنانچہ جب طمانچے کی گونج سنائی دیتی تو سب کو پتہ چل جاتا کہ جناب مخموری ہاؤس میں داخل ہوئے ہیں اور انہوں نے نشہ پورا کرنے کے لیے کسی کو مشتعل کر کے اپنا کوٹہ پورا کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ مرحوم اپنے محسن حکمرانوں کے خلاف اپنے انقلابی نظریات کی وجہ سے بہت سائنسی انداز میں کام کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں ایک روز ٹی ہاؤس میں بیٹھا اپنے ادبی دوستوں سے گپ شپ میں مشغول تھا کہ موصوف کی آمد کا ''الارم'' سنائی دیا۔ میری خوش بختی کہ اس روز موصوف سیدھے میری ٹیبل پر آئے۔ ان کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ طمانچہ غالباً زیادہ زوردار تھا۔ انہوں نے ایک حاکم کا نام لیا اور سخت غصے کی حالت میں مجھے مخاطب کر کے فرمایا ''تم نے اسے گالی کیوں دی ہے؟'' میں ان کی بات پر حیران ہوا۔ میں نے کہا ''قبلہ میں نے تو انہیں گالی نہیں دی۔ میں تو ان کے کئی اچھے کاموں کی وجہ سے ان کا احترام کرتا ہوں!'' بولے ''نہیں تم نے انہیں گالی دی ہے!'' میرے ساتھ بیٹھے دوستوں نے بھی انہیں سمجھایا کہ اس نے گالی نہیں دی مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ جب میری بار بار کی وضاحتوں کے باوجود وہ بضد رہے کہ میں نے گالی دی ہے تو میں نے تنگ آ کر دو گالیاں انہیں اور چار گالیاں حاکم کو سنائیں جس پر ان کا چہرہ کھل اٹھا ان کے انقلابی نظریات کی تسکین جو ہو گئی تھی!

مرحوم آخری عمر میں بہت حساس ہو گئے تھے اور اکثر ناقدری زمانہ کا گلہ کرتے تھے۔ کسی سابقہ حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں سرکاری خزانے سے چند لاکھ روپے دیئے مگر اگلی حکومت نے ان سے اس رقم کی واپسی کا تقاضا کیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سخت آزردگی کی حالت میں بیٹھے زمانے کی ناقدری کا شکوہ کر رہے تھے۔ اس کیفیت میں اُن کے چہرے کا رنگ مزید گہرا ہو گیا تھا۔ وہ اگرچہ مجھ سے اکثر ناراض رہتے تھے مگر میں انہیں اندر سے پسند کرتا تھا کہ کوئی تو ہے جو زمانے کی ملامت کی پروا نہیں کرتا اور وہی کرتا ہے جو اس کی خاندانی تربیت کا خاصہ ہے۔ چنانچہ اس روز میں نے انہیں بہت تسلی دی اور کہا کہ آپ دل گرفتہ نہ ہوں۔ آپ ایسے نابغہ روزگار لوگوں کے ساتھ ہر دور میں یہی سلوک ہوا ہے۔ جس پر انہیں قدرے حوصلہ ہوا اور وہ غالباً پہلا موقع تھا کہ وہ مجھ سے خوش نظر آئے تھے!

جناب ایف ڈی مخمور اور مے نوشی لازم و ملزوم تھے بلکہ ایک وقت ایسا آیا کہ ظالم و مظلوم ہو کر رہ گئے۔ ان کا انتقال حسرت آیات بھی اسی حوالے سے ہوا۔ مرحوم اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے شغل فرما رہے تھے اور ساتھ کباب کھا رہے تھے۔ اس دوران ساقی نے ان کے ہوش کچھ ایسے اڑائے کہ انہوں نے شراب سیخ پر اور کباب شیشے میں ڈال دیا اور پھر یہ شراب پینے کی کوشش میں شراب یعنی سیخ ان کے حلق میں پھنس گئی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے! اچھی بات یہ ہے کہ ان جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے اور پیدا ہونے بھی نہیں چاہئیں!

متفرق شاعری

گلا کیسے کروں میں چارہ گر سے
وہ خود اُلجھا ہوا ہے اہل شر سے
طلسمات جہاں ان میں چھپے ہیں
صدائیں آ رہی ہیں جو کھنڈر سے
کچھ انساں آج بھی قابیل سے ہیں
جہاں میں گھومتے ہیں جو نڈر سے
میں آئینہ رکھوں گا ان کے آگے
چھپے رہتے ہیں جو میری نظر سے
بچالو تارِ اُلفت ہے دلوں کو
بھڑک اُٹھتے ہیں شعلے بھی شرر سے
غزل کو روشنی گوہر ملے گی
سجا لو فکر کو نورِ سحر سے

گوہر ملسیانی/خانیوال

جب تم اُس کے گھر جاؤ گے
ہونے صرف نظر جاؤ گے
اتنے آنسو رو رو کر تم
سوکھی نہریں بھر جاؤ گے
لوگو تم تو چھوڑ کے مجھ کو
اپنے اپنے گھر جاؤ گے
کس کو خبر تھی رقص سکھا کر
سب کو قلندر کر جاؤ گے
یارو اس جنگل کو نہ آنا
آتے جاتے ڈر جاؤ گے
ٹیڑھی سوچیں چھوڑ کے پیارے
سیدھے رستے پر جاؤ گے

یار سے ایسی یاری رکھ کر
آصف ثاقب مر جاؤ گے

آصف ثاقب/بوئی ایبٹ آباد

پھر مرے پیار کی ہر لب پہ کہانی ہوگی
اپنی اس شہر سے پھر نقل مکانی ہوگی
ایسی آنکھوں پہ غزل کہنا بہت مشکل ہے
ایسی آنکھوں پہ تو قربان جوانی ہوگی
اور کچھ دیر ابھی پھول نچھاور ہوں گے
اور کچھ دیر ابھی عطر فشانی ہوگی
تیرا انداز جو دیکھے گا تو مر جائے گا
تیرے انداز پہ اب جان لٹانی ہوگی
سامنے آکے نہ پہچان سکا آج مجھے
اُس کی آنکھوں میں مری شکل پرانی ہوگی
اُن حسینوں پہ نہ رونے کا اثر ہوگا اسدؔ
ان حسینوں سے نہ شائستہ بیانی ہوگی

اسد اعوان/جھنگ

خدا ہمارا خدائی تقسیم کر رہا ہے
اسی لیے تو خدا سے شکوہ نہیں کیا ہے
بدن مسخر کیے ابلیس نے ہمارے
خدا ہماری زبان تک ہی رُکا ہوا ہے
کوئی ہمارے خلاف بولے تو بولنے دو
کسی کے ٹکڑوں سے پلنے والا تو بولتا ہے
کسی وجہ سے جو ایک در بند ہو بھی جائے
کئی دروں کو خدا مری جان کھولتا ہے

نگر کا باسی یقیں دریدہ ہوا ہے ایسا
مقیم ختم مقام تک ہی رُکا ہوا ہے
کوئی بھی دریا اب اپنی حد سے نہیں نکلتا
انیس احمد سمندروں نے گلہ کیا ہے
زبان میزان میں پڑی ہے انیس احمد
یہ دیکھنا ہے اسے کوئی کیسے تولتا ہے

انیس احمد/ملک وال

سمندر سے نکالا جا رہا ہے
نئی حیرت میں ڈالا جا رہا ہے
مجھے سب کچھ نظر آنے لگا ہے
مرے گھر سے اُجالا جا رہا ہے
ڈرایا جا رہا ہے ہر کسی کو
دلوں میں خوف پالا جا رہا ہے
مجھے گرنے سے پہلے مار دے گا
وگرنہ کیوں سنبھالا جا رہا ہے
زمیں ہو، یہ سمندر ہو کہ دریا
مرا سب کچھ کھنگالا جا رہا ہے
تری یادیں منڈیروں پر پڑی ہیں
مجھے گھر سے نکالا جا رہا ہے

زاہد سعید زاہد

رقص کرتی ہے فضا اور فسوں بولتا ہے
آج تک قیس کا صحرا میں جنوں بولتا ہے
درد کے ابر قدم اس کے اڑا دیتے ہیں
رنج ہوتے ہیں کبھی ختم وہ جوں بولتا ہے

متفرق شاعری

شور جھرنوں کا مدھر تان ہے کوئل کی طرح
حسن جب بولتا ہے اس کا تو یوں بولتا ہے
حرف اک بھی میں نہیں بول رہا اس کے خلاف
کیا کروں میں یہ میرا حالِ زبوں بولتا ہے
کون سمجھے گا نیازت تری باتوں کو میاں!
حرمتِ لفظ نہیں ہے جہاں کیوں بولتا ہے
مختصر وقت میں گزری ہے مری عمر نیاز
خواب ٹوٹے ہیں تمناؤں کا خوں بولتا ہے

نیازت علی نیاز

ہاتھ رکھو، یہیں اداسی ہے
یہ مرا دل نہیں ، اداسی ہے
ابتدا میں تو اتنا خوش مت ہو
مجھ میں آگے کہیں اداسی ہے
تو بھی اتنا نہیں قریب مرے
جتنی دل کی قریں اداسی ہے
دیکھ اُس حسنِ سوگوار طرف
دیکھ کتنی حسیں اداسی ہے
اس پہ قصرِ خوشی نہ ٹھہرے گا
میرے دل کی زمیں اداسی ہے
رنج و بہجت تو بعد کے ہیں گماں
میرا پہلا یقیں اداسی ہے
آنکھ یا پھیلتا ہوا کاجل
شام یا سرگیں اداسی ہے
تم اداسی کو دیکھ سکتے ہو
میں جہاں ہوں وہیں اداسی ہے

شہزادنیّر/گوجرانوالہ

ضمیر ایسے کمال اپنے فن میں تھے ہی نہیں
ہم اُس کی سوچ میں تو تھے سخن میں تھے ہی نہیں
ہمیں یہ ناز تھا ہم موت سے نہیں ڈرتے
مگر وہ فیصلے دار و رسن میں تھے ہی نہیں
ہر ایک سمت میں خالی صدائیں بکھری تھیں
نجانے لوگ کہاں تھے، سخن میں تھے ہی نہیں
تمہیں بتاؤ شب وصل کیسے کہہ دوں اسے
بدن تُمھارا تھا اور تُم بدن میں تھے ہی نہیں
لپٹ کے لوگ ہمارے کفن سے رو رہے تھے
مزے کی بات یہ تھی، ہم کفن میں تھے ہی نہیں
وہی زمین ، وہی آسمان، اور وہی لوگ
مگر یوں لگ رہا تھا ہم وطن میں تھے ہی نہیں
تمام عمر کٹی بوکھلاہٹوں میں ضمیر
بیاں ہوئے وہ سخن جو ذہن میں تھے ہی نہیں

ضمیر طالب/ برطانیہ

کیا کچھ نہیں تھا بس میں مگر دل نہیں کیا
کھونے کے خوف سے اسے حاصل نہیں کیا
محسوس کر لیا تھا بھنور کی تھکان کو
یونہی تو خود کو رقص پہ مائل نہیں کیا
چھو کر وہ خال و خد گئے کوزہ گری کو ہم
تاثیر لمس یار کو زائل نہیں کیا
خود پر حرام سمجھا ثمر کے حصول کو
جب تک شجر کو چھاؤں کے قابل نہیں کیا
جاگے ہوؤں سے بڑھ کے ہمیں باخبر سمجھ
ہم کو ہماری نیند نے غافل نہیں کیا

اظہر فراغ / بہاول پور

کسی شوخ پر جب سے آیا ہوا ہے
بہت شور دل نے مچایا ہوا ہے
زمیں اپنے ہاتھوں سے جس نے بنائی
فلک بھی اُسی کا بنایا ہوا ہے
سرِ راہ کوئی مسافر نہ بھٹکے
دیا دل کا ہم نے جلایا ہوا ہے
روانی بتاتی ہے ان آنسوؤں کی
کہ آنکھوں میں دریا سمایا ہوا ہے
گریباں اگر چاک ہوتا ہے تو ہو
عدو کو گلے سے لگایا ہوا ہے
وہی آ کے لوری سنائے گا مجھ کو
زمانے سے جس نے جگایا ہوا ہے
مرے سر پہ ہی آ کے بیٹھے گا جابر
ہما دیر سے اک اُڑایا ہوا ہے

جابر نظامی

آگ پانی کے برابر نہیں ہونے دیتا
عشق صحرا کو سمندر نہیں ہونے دیتا
کچھ تو میرا یہ مقدر نہیں ہونے دیتا
اور کچھ کام ستمگر نہیں ہونے دیتا
یونہی چپ چاپ کنارے پہ کھڑا رہتا ہوں
خوف اندر کا شناور نہیں ہونے دیتا
خواب ٹوٹیں تو لہو دل کا اُمڈ آتا ہے
وہ مری آنکھ کو پتھر نہیں ہونے دیتا
خود بھی اس دھوپ میں جلنا ہے مقدر اُس کا
جو کہ پودوں کو تناور نہیں ہونے دیتا

ہے نہ ہی پیچیدہ مسائل سے اُلجھ کر اپنی شاعری کو بھاری بھر کم زمینوں میں بانٹنے کا کشٹ کرتی ہے۔ بلکہ فکر کا ریشم بنتی ہے اور اسی ریشم سے زندگی کی دُھن پر پھول جیسے شعر چن دیتی ہے۔

ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی ذہن بوجھل نہیں ہوتا اور نہ ہی آنکھیں تھکن محسوس کرتی ہیں۔ بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے ہم خوش گل پر آہستہ آہستہ خوشبو کے جزیروں کی طرف محوِ خرام ہیں۔اُن کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ انہیں اپنے عہد کا ایک اثاثہ تسلیم کیا جائے اور ان کے فن میں اور زیادہ نکھار، تازگی اور جاذبیت آئے۔آمین

ان کی تحریروں میں زندگی کی رمق نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کے معیار کے ساتھ ان کی شہرت کا یہ عالم رہا تو وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کا شمار ملک کی مقبول ترین شاعرات میں ہونے لگے گا۔ اس کی فاختہ کے اُجلے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے اپنے فکر کا ریشم بنتی ہیں۔میری دعا ہے کہ ہمہ وقت حرف وہنر میں محو گلستانِ ادب کے اس پھول کا شعری سفر ہمیشہ تازہ دم رہے۔
آمین

معروف کالم نگار، ناول نگار، شاعرہ وادیبہ فوزیہ غزل نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا خیال ہے:

''ڈاکٹر صغریٰ صدف کی غزلیں اپنی لفظیات اور ہنرکاری کے حوالے سے جدید ہیں۔ ان میں معاصر غزل کے رجحانات بھی ہیں اور نسائی غزل کے چند خدوخال بھی لیکن اس حوالے سے اُسے بعض جگہوں پر واضح تفوق نظر آتا ہے۔ یہ تفوق اور امتیاز اُسے اس کے جراتِ اظہار اور انا نے عطا کیا ہے۔ڈاکٹر صغریٰ صدف کی نظمیں بعض حوالوں سے روایتی ہیں اور بعض حوالے ان میں جدید اسلوب کے حامل بھی نظر آتے ہیں۔

ان کی نظمیں اپنے اختصار کے باعث غزل کا سا تاثر اُبھارتی ہیں۔ ان میں ایک نامیاتی وحدت، روانی اور وحدتِ تاثر ان کو قاری کے لیے مرغوب بناتی ہے۔وہ اپنے فن کے لیے کسی رعایت، کسی کھوکھلی گواہی یا کسی عارضی سہارے کی متمنی نہیں۔اداسی کے بھیگے موسم میں بھی اس کے دل کا چراغ گل نہیں ہوا بلکہ برابر جل کر اپنے ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ڈاکٹر صغریٰ صدف اگر اسی تسلسل سے آگے بڑھیں گی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کئی سنگِ میل ان کے قدموں کی دھول دیکھیں گے۔''

نقصان تیرے دھیان میں اکثر ہوا مرا
ہاتھوں سے گر کے ٹوٹ گیا آئینہ مرا
وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ خوش ہوں میں اس کے ساتھ
واقف نہیں ہے درد سے درد آشنا مرا
میں پوچھ ہی نہ پائی تھی، کس حال میں ہے وہ
بے حال راستوں میں ملا ہم نوا مرا
میں اس کو ڈھونڈتی ہوں کہیں دل کے آس پاس
اور دل میں جھانکتا ہی نہیں بے وفا مرا
نکھرا کبھی جو حسن مرا اُس کی یاد میں
پھر آئینہ بھی کر نہ سکا سامنا مرا
بے دخل ہو چکا ہے جو دل کے دیار سے
دنیا سمجھ رہی ہے اُسے آشنا مرا

نعت

مدینہ تو جہانِ آرزو میں ہے
مدینہ تو مری بھی آبرو میں ہے
مدینے کو گلوں میں ڈھونڈنے والو
مدینہ تو گلوں کی گفتگو میں ہے
مدینے کو کہیں جا کر پکارو تم
مدینہ تو فضائے ہوبہو میں ہے
مرے سینے کی دھڑکن میں مدینہ ہے
مدینہ تو نگاہِ جستجو میں ہے
مدینہ تو درودوں میں بھی ملتا ہے
مدینہ تو مرے سجدوں وضو میں ہے
مدینے کو اگر تم پیار سے دیکھو
مری نس نس مری سانسوں لہو میں ہے
حقیقت میں یہی کہنا مناسب ہے
وہ تیری بھی وہ میری آرزو میں ہے
مدینے کو دلوں میں جھانکنے والو
مدینہ پیار کی شاخِ نمو میں ہے
پرندوں میں چلو املاک دیکھو تم
مدینہ تو نوائے خوش گلو میں ہے
(املاک احمد جدران/اوکاڑا)

ایک مدت سے اُسے دل میں بسا رکھا ہے
میں تری یاد کو بے گھر نہیں ہونے دیتا
آ کے پیروں سے لپٹ جاتا ہے سایہ ارشدؔ
وہ مجھے میرے برابر نہیں ہونے دیتا
ارشد محمود/سرگودھا

قیام کرتے ہوئے بھی سفر میں رہتا ہوں
مگر یہ لوگ سمجھتے ہیں گھر میں رہتا ہوں
یہ تختی ہے کسی ہم نام کی لگی ہوئی
میں ایک قیس، کہاں بام و در میں رہتا ہوں
انا پسند ہوں کتنا، نہ پوچھیے مجھ سے
یہ اور بات ہے، میں درگزر میں رہتا ہوں
یوں لگتا ہے یہ خدوخال ہی نہیں میرے
کسی کے جیسا کسی کے اثر میں رہتا ہوں
سخن کروں تو کمی رہتی ہے اذیت میں
میں تیرے بعد مسلسل ہنر میں رہتا ہوں
نہ جانے اُس کی زباں کس کا ذکر کرتی ہے
میں بدنصیب تو حرفِ دگر میں رہتا ہوں
مجھے دعا مرے اجداد کی، سو میں ساحلؔ
جہاں بھی جاؤں ہمیشہ ثمر میں رہتا ہوں
ساحلؔ سلہری/سیالکوٹ

میرے اظہار کو زباں دے دے
کوئی الزام مہرباں دے دے
میں نے مانگے تھے چند لمحے فقط
کب کہا تھا کہ آسماں دے دے
جس کو چاہے تو سب عنایت کر
جس کو چاہے تو گلستاں دے دے
گر میرے ساتھ چل نہیں سکتا
مجھ کو میری ہی داستاں دے دے
ان کو دل میں سجا کے رکھوں گا
اپنے غم سارے جانِ جاں دے دے
اب تو اظہار کر عنایت کا
اب تو شاہد کو بھی اماں دے دے
عبدالرشید شاہد/ننکانہ شریف

کرنا ہے کچھ نیا تو پھر ایسا کمال کر
لے کہیں سے رات کو سورج نکال کر
میں زندگی سے تنگ ہوں مجھے موت ہے قبول
میرا خیال چھوڑ تو اپنا خیال کر
دوں گا جواب میں ترے ہر اک سوال کا
جتنے سوال کر سکے اُتنے سوال کر
اب بھول اُسے تو خسار بچ کر یار
اب بھول اُسے تو نہ اُس کا ملال کر
آ کر گلے لگا تو مجھے سب کے سامنے
آ کر تو آج یہ میری سانسیں بحال کر
جانے کی بات چھوڑ کر کہتے ہو تھا مذاق
تم نے تو رکھ دیا ہے مرا دل نکال کر
شفیق عطاری

آنکھوں میں انگارے بھر کے کاٹی رات
ہم نے اللہ اللہ کر کے کاٹی رات
دیکھنے والوں کی نظروں میں زندہ تھے
اس کی یاد میں لیکن مر کے کاٹی رات
اک انجانے خوف کا پہرہ سر پہ تھا
سانسوں کی آواز سے ڈر کے کاٹی رات
ان آنکھوں میں ڈوب کے مرنا چاہا تھا
میں آنکھوں میں سپنے بھر کے کاٹی رات
جیتنے والوں کی شب گزری سوچوں میں
کیسے پیار کی بازی ہر کے کاٹی رات
وصل کی شب کیا پایا صابرؔ کیا کہنا
دامن میں ہر نعمت بھر کے کاٹی رات
محمد صدیق صابر/ننکانہ شریف

اختر شماریوں میں سماوات ناپتے
گزرا ہے سال ہجر کے دن رات ناپتے
دیوانگی میں شہر کے حالات ناپتے
صحرا میں آ گئے ہیں مضافات ناپتے
قائل حسب نسب کے نہیں تھے وگرنہ ہم
چلنے سے پہلے آپ کی اوقات ناپتے
کیسے کٹی ہے ہجر کی کالی طویل رات
وسواس، واہمے کبھی خدشات ناپتے
آئی نہیں جواب کی باری حضورِ عشق
کب تک رہیں گے آپ سوالات ناپتے
مقدور بھر وفا تھی پیالے میں آنکھ کے
ایسے میں کیسے شدتِ جذبات ناپتے
سدرہ سحر عمران

جگنو، ستارے، تتلیاں لایا کروں گا میں
اے جھیل! ترا حسن بڑھایا کروں گا میں
ہوں افتخار میں بھی کسی پیڑ کی طرح
اپنے علاوہ سب پہ ہی سایا کروں گا میں
شہزادی! تیرے قدموں میں رکھنے کے واسطے
گلشن سے پھول توڑ کے لایا کروں گا میں
عذرا! میں جا رہا ہوں ترا شہر چھوڑ کر
لیکن کبھی کبھار تو آیا کروں گا میں
عمران ہے نہ تو ہے نہ کالج کی لڑکیاں
اب کس کو اپنے شعر سنایا کروں گا میں
افتخار اشعر/اوکاڑہ

دریائے شوق تری روانی کی خیر ہو
تیری رگوں میں دوڑتے پانی کی خیر ہو
جتنے حسیں ہیں سب کا رہے حسن شادباد
جتنے جواں ہیں اُن کی جوانی کی خیر ہو
اس نے بنائے ہیں میرے روشن ترین دن
گھر میں مقیم رات کی رانی کی خیر ہو
ہو عاشقاں نصیب تمہیں زندگی دراز
راہِ وفا میں اشک فشانی کی خیر ہو
ان میں بسی ہوئی ہے کسی ہم نشیں کی یاد
یاروں کی ایک ایک نشانی کی خیر ہو
اس کے سبب سے مجھ پہ کھلے زندگی کے رنگ
اے سلسلہ غم تیرے بانی کی خیر ہو
جانا ہے ایک ایک نے ناصر علی سمیت
پھر بھی ہمارے عالم فانی کی خیر ہو

ناصر علی/لاہور، چنیوٹ

آج تو غمگین شامیں کہہ گئیں
سب تمنائیں ادھوری رہ گئیں
رنج کے بادل بھی سارے چھٹ گئے
رونے سے خوشیاں بھی ساری بہہ گئیں

ساتھ میرے رہتے تھے جو رات دن
دیکھ لو اب اُن کی یادیں رہ گئیں
ہے تعجب جاری ہیں سانسیں میری
وقت کے کتنے تھپیڑے سہہ گئیں
جن کی بنیادوں میں یکسر جھوٹ تھا
ضربِ حق سے وہ فصیلیں ڈھ گئیں

خادم علی انجم

نامور کالم نویس، مزاح نگار، شاعر، سفرنامہ نگار اور ڈرامہ نویس

عطاء الحق قاسمی

کی کتب کے نئے ایڈیشن شائع ہوگئے ہیں

❀ مجموعہ/ قیمت:1200روپے
❀ ہنسنا رونا منع ہے/ قیمت400روپے
❀ بلبلے/ قیمت:200روپے
❀ وصیت نامے/ قیمت:300روپے
❀ دلی دور است/ قیمت: 250روپے
❀ شوقِ آوارگی/ قیمت:400روپے
❀ دنیا خوبصورت ہے/ قیمت: 300روپے
❀ بارہ سنگھے/ قیمت:500روپے
❀ جرمِ ظریفی/ قیمت: 500روپے
❀ خندِ مکرر/ قیمت: 450روپے
❀ ڈھول ڈھپا/ قیمت: 500روپے
❀ آپ بھی شرمسار ہو/ قیمت: 400روپے
❀ مزید گنجے فرشتے/ قیمت: 400روپے
❀ شرگوشیاں/ قیمت: 400روپے
❀ ملاقاتیں ادھوری ہیں/ قیمت:350روپے
❀ عطاء الحق قاسمی شاداب موسموں کی آواز/ قیمت350روپے
❀ روزنِ دیوار سے/ قیمت: 500روپے

ناشر:

نستعلیق مطبوعات F-3 فیروز سنٹر غزنی اسٹریٹ اردو بازار، لاہور 042-7351963

افسانہ

روگ

انیلہ بھلر/امریکہ

کیوں کیا تو نے ایسا جرم۔ اپنے گھر میں خود ہی آگ لگا دی۔ اب اس عمر میں یہ پچھن ہیں تیرے۔ تجھ سے اچھی تو کنجریاں ہیں رنڈی کہیں کی۔

میں آئینہ کے سامنے کھڑی تھی۔ آئینہ مجھ سے بول رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے سوال کر رہا تھا اور میں اس کے سوالوں کے جواب میں چپ سادھے کھڑی تھی۔ ایسے میں کوئی پتھر آئینے کو لگا اور خون میرے ماتھے سے رسنے لگا۔

آہ...... مجھے میری ہی آہ سنائی دینے لگی۔

اتنی آگ تھی تیرے اندر؟

آگ اتنی تھی تو شوہر کو بتایا ہوتا۔

غیر مردوں سے یارانے کیوں لگائے۔

مجھے پھر سے جانی انجانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

پلو شہ جار ہاہوں میں۔

عمر کی آواز کانوں میں پڑی تو میں کمرے سے باہر دوڑی لیکن میرے جانے سے پہلے ہی وہ دفتر کے لیے جا چکے تھے۔ اب گھر تھا، میں اور میری تنہائی۔

شاید میری تنہائی ہی میرے لیے میری تباہی لا رہی تھی۔ میں ایسی بنتی جا رہی تھی جیسی میں کبھی نہیں تھی۔ میں وہ کچھ کرتی جا رہی تھی جس کا تصور میں نے عمر بھر نہیں کیا تھا لیکن کچھ تھا جو مجھے اندر ہی اندر تبدیل کرتا گیا۔

''عمر آج شام ذرا جلدی آ جایئے گا۔''

میں عمر سے التجا کر رہی تھی۔

''کیوں تمہیں کچھ کام ہے؟'' مجھے سوجھا نہیں کہ میں کیا جواب دوں۔ میں بیوی تھی۔ تو بہانا کیا کام تھا مجھے اپنے شوہر سے۔ مجھے تو بس عمر کے پاس بیٹھنا، اس کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرنا اچھا لگتا تھا لیکن مجھے شادی کے بعد سے ایسا وقت نصیب ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''نہیں کام تو کچھ بھی نہیں''

''نہیں آ سکوں گا۔ شام کی کچھ میٹنگز ہیں۔''

وہ ٹائی لگا رہے تھے اور میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے'' میں تھکی تھکی سی بولی۔

''کھانا کھا کر آئیں گے۔''

''ہاں ظاہری بات ہے'' وہ کار کی چابیاں اُٹھاتے ہوئے بولے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

یہ ایک وسیع و عریض ڈبل سٹوری بنگلہ تھا جس میں میں بیاہ کر آئی تھی۔ بے حد کھلا سرسبز و شاداب لان، جس میں بے حد حسین رنگوں کے گلاب کھلے رہتے تھے لیکن میں تھی کہ مرجھاتی جا رہی تھی۔ مجھے کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ بچپن سے گھر کا ماحول سخت رہا تھا۔ ابا، اماں میں خاص محبت نہیں تھی اور کوئی بڑا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ دو بہنیں اور دو بھائی میں گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ چھوٹی تھی شاید اسی لیے میری کچھ خاص اہمیت نہیں تھی۔ بہن اپنے گھر کی ہو چکی تھی۔ بھائی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ مجھے یونیورسٹی جانے کا شوق تھا لیکن ابا نے بی اے کے بعد پڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ میں آزادانہ گھر سے باہر جاتی یا مجھ سے ملنے کوئی گھر آ جاتا۔ ابا اور اماں کو میرے لیے رشتہ چاہیے تھا وہ بھی کئی شرائط کے ساتھ۔ لڑکا پڑھا لکھا ہو، امیر ہو، جائیداد کا مالک ہو، قبول صورت ہو، ہماری ہی ذات سے ہو۔ وغیرہ وغیرہ اب اتنی شرائط کے بعد رشتہ ملنا آسان بھی کہاں تھا لیکن اماں ابا تھے کہ کسی صورت سمجھوتے پر تیار نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس دوران کئی رشتے آتے تھے لیکن بات اکثر ہی ذات برادری پر آ کر رُک جاتی تھی۔ بھائی حالات سے چھٹکارہ پا کر امریکہ جا بسے تھے اور وہیں پر اپنی پسند سے شادیاں بھی رچا بیٹھے تھے۔ ایسے میں نزلہ مجھ پر ہی گرتا تھا۔ ہوتے ہوتے میری عمر ۲۹ سال ہو گئی۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی لیکن ابا اور اماں ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ گھر کی دیواریں مجھے کھانے لگی تھیں۔ میری کوئی دوست نہیں تھی۔ سارا وقت میں کرتی ہی کیا کہ مزید تعلیم حاصل کرنا ابا کو گوارا نہیں تھا۔ دوست

بنانے کی آزادی میرے پاس نہیں تھی۔ مجھے اپنی نجات صرف شادی میں نظر آتی تھی اور وہی ہو نہیں رہی تھی۔

میں اپنی بڑی بہن کو دیکھ کر اکثر حسد میں مبتلا ہو جاتی تھی۔ کیا مزے تھے اس کے۔ شوہر تھا، بچے تھے، سسرال کا پیار تھا۔ اس کے گھر میں جیٹھ، جٹھانیاں، دیور اور دیورانیاں تھیں۔ سب کے بچے تھے۔ بھرا ہوا گھر تھا اور ایک ہمارا گھر تھا جو مجھے اکثر قبرستان جیسا لگتا تھا۔

میری ساری اُمیدوں کا محور بس میری شادی تھی۔ مجھے لگتا تھا شادی ہوتے ہی خدا میری ساری محرومیاں دور کر دے گا۔ میں ساری عمر شوہر کے پاؤں سے بندھی رہوں گی، اسے دیکھوں گی، اس سے باتیں کروں گی، اُسے پوچھوں گی۔ اسے طرح طرح کے پکوان کھلاؤں گی لیکن شومیٔ قسمت

عمر حیات خان کو محض اپنے آپ سے دلچسپی تھی۔ وہ تنہائی جو میں شادی سے پہلے باہر محسوس کرتی تھی اب آہستہ آہستہ اپنے اندر محسوس کرنے لگی تھی۔ میں سمیٹتے ہوئے بکھرتی جا رہی تھی۔ بنتے ہوئے ٹوٹتی جا رہی تھی۔ میرے سسرال میں بھی کوئی نہیں تھا جو میرے دکھ کو سمجھتا۔ مجھے دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف عمر کا وقت، عمر کی دلچسپی چاہتی تھی لیکن وہی تھا جو مجھے نصیب نہیں ہو رہا تھا۔

ایسے ہی زندگی گزارنی تھی تو پھر انہیں شادی کی کیا ضرورت تھی۔ میں اکثر یہ سوال پوچھتے پوچھتے رک گئی کہ عمر کی خشک مزاجی یا سنجیدہ طبیعت کہہ لیجیے کہ میں عمر سے محض کام کی چند باتوں کی سوا کچھ نہ کہہ سکی اور جو میں نہ کہہ سکی وہ کبھی بھی سن نہ سکی۔

شادی کو ایک سال گزر چکا تھا۔ میں ۳۱ سال کی ہو چکی تھی۔ میں نے ۱۰ سال شادی کا انتظار کیا۔ اس لمحہ کا انتظار کیا جب میں اپنی زندگی جی سکوں گی لیکن اس زندگی کے معنی سے قطعی ناآشنا ہوتی جا رہی تھی۔ عمر اپنے کام میں مگن تھے۔ انہیں صرف پیسے بنانے سے دلچسپی تھی۔ گھر بنانے کی، فیملی بنانے کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مجھے کبھی کبھی لگتا تھا مجھے کسی جرم میں عمر قید ہو چکی ہے۔ اس قید میں واقعی عمر گزرنے والی تھی۔

''عمر ایک بات کہنا چاہتی ہوں'' میں ایک روز ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ہاں''

عمر کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کسی ڈاکٹر کے پاس جائیں۔

کس لیے؟

عمر ہماری شادی کو کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن بچے......

''میں کیوں جاؤں؟ تم جانا چاہتی ہوں تو چلی جاؤ۔''

وہ یہ کہہ کر آناً فاناً کمرے سے نکل گئے۔

بی بی بظاہر تو آپ کی رپورٹس ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنے میاں کا بھی چیک اپ کرالیں۔ Make sure کرنے کے لیے سب ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر کے مشورے کے بعد میں نے عمر سے کئی بار کہا لیکن عمر کو وقت نہیں تھا یا وہ جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میں نہیں جانتی بس وہ نہیں گئے۔

میں محبت کی پیاسی تھی۔ پیاس پوری نہیں ہو رہی تھی۔ سو سوکھی جا رہی تھی۔

ایسے میں ایک روز میری ملاقات اس سے ہوگئی اور پھر نہ جانے کیوں میں اس کی جانب کھنچتی چلی گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

وہ ہر روز مجھے ملنے آتا تھا۔ آتے ہوئے میرے لیے گلاب لانا کبھی نہ بھولتا تھا۔ میری جانب دیکھتا تھا تو میں خود کو مدہوش محسوس کرتی تھی۔ وہ میٹھی میٹھی آواز میں میرے کان میں سرگوشی کرتا تھا تو میں جھرجھرا جاتی تھی۔ میرے وجود سے مجھے اس کی مہک آنے لگی تھی۔ مجھے اتنا سکون عمر کے ساتھ آج تک نہیں مل سکا تھا جتنا میں اس کے پاس محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کی آواز سن کر میری صبح ہوتی تھی، اس کا چہرہ دیکھ کر میری شام......

وہ مجھے جیتتا جا رہا تھا اور میں اس کے آگے خود کو ہارتی جا رہی تھی۔

وہ مجھے ایک روز شہر کے شاپنگ مال میں ملا تھا۔ مجھے واپسی پر ڈرائیور نے لینے آنا تھا لیکن عمر نے اسے کسی اور کام سے بھیج دیا تھا۔ ایسے میں شایان نے مجھے گھر تک چھوڑا تھا تو میں اسے جانے کا بول کر اندر لے آئی۔ پھر وہ وہاں سے کبھی نہیں گیا، کہیں نہیں گیا۔

عمر میری کالج کی کچھ فرینڈز جو مجھے حال ہی میں بہت سالوں بعد ملی ہیں گھومنے جا رہی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ جا سکتی ہوں۔

ہاں چلی جاؤ۔

ایک ہفتہ کا پروگرام ہے۔

ٹھیک ہے۔

عمر کو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو میری سہیلیوں سے کیا ہوتی۔ اسے پرواہ نہیں تھی یہ جاننے میں بھی دلچسپی نہیں تھی کہ میں آخر کن کے ساتھ جاؤں گی اور کہاں جاؤں گی۔

وہ سات دن میری زندگی کے بہترین دن تھے۔ شایان کے ساتھ، اُس کی باہوں میں گھومتے ہوئے میرا سارا وجود مہکنے لگتا تھا۔ میں بولتی تو وہ گھنٹوں میری باتیں سنتا۔ ابا کی باتیں، امی کی باتیں، بہن کے قصے، بھائیوں کی کہانیاں۔ اسے میری ہر بات سے دلچسپی تھی۔ وہ سنتا تھا اور مسکراتا تھا۔

وہ کون تھا، کس خاندان سے تھا، ہمارا رشتہ کیا تھا مجھے ان ساری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کہ صرف توجہ کی طلبگار تھی۔ مجھے سوا اس کے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ وہ سات دن تھے یا سات پل میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دن میرا اثاثہ تھے۔ میری عمر بھر کی تنہائی دور کرنے کو کافی تھے وہ سات دن۔

واپسی پر بھی عمر کا رویہ ویسے ہی تھا۔ مجھے اس سے توقع نہیں کہ لیکن پھر بھی ایک اندازہ تھا، خواہش تھی یا خیال کہ شاید وہ مجھ سے ٹرپ کے بارے میں کچھ کہے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مگر پھر وہ بھی نہیں ہوا جو پچھلے کئی دنوں سے ہو رہا تھا۔

اس کے بعد شایان دوبارہ نہیں آیا۔ وہ جس طرح مجھے ملا تھا اسی طرح کھو گیا۔ اس کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔ میرے پاس اس کے گھر کا نمبر نہیں تھا۔ دفتر کا تھا جہاں فون کیا تو پتہ چلا وہ وہاں سے استعفیٰ دے کر جا چکا ہے۔ میں ٹوٹتی گئی۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں بھری جوانی میں بیوہ ہو چکی ہوں۔

کیا شایان کے لیے میں محض وقت گزاری کا ذریعہ تھی۔ میں خود سے سوال کرتی تھی۔

ہاں اور نہیں تو کیا۔ اس نے تم سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ تم تو خود ہی اپنا وجود اسے سونپتی جا رہی تھیں۔ وہ وقت گزاری نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

وقت رُکتا نہیں ہے۔ اس کی یہی بات شاید سب سے اچھی ہے۔ وقت آگے بڑھتا ہے تو بہت کچھ بدل بھی جاتا ہے۔ میں بھی بدل گئی تھی۔ میں عمر کے ساتھ رہ رہ کر عمر جیسی ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بیگانہ تھا اور میں اس سے بے خبر۔

اب میں نے ڈرائیور کے ساتھ جانے کے بجائے خود ہی گاڑی چلانا شروع کر دی تھی۔ میرے انداز اب خود ہی بدلتے جا رہے تھے۔ اب میں وہ دقیانوسی نہیں رہی تھی جیسی میں تھی۔ اب میری زندگی میں کئی لوگ شامل تھے۔ ردا، فرحان، ضیاء،

ٹرن ٹرن ٹرن

Per Night کیا ریٹ ہے؟

سوری رانگ نمبر۔ میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ فون پھر سے بجا۔

ٹرن ٹرن ٹرن

ہیلو

یہ رانگ نمبر نہیں ہے بالکل ٹھیک نمبر لگایا ہے۔

جی بتایئے کیا چاہیے آپ کو؟

Per night rate کی بات دہرائی گئی۔

میں بھی نہیں کس چیز کا ریٹ پوچھ رہے ہیں آپ؟

ارے تیرا اور کس چیز کا ریٹ پوچھ سکتے ہیں۔ تیرے پاس اور کوئی مال بھی ہے کیا؟

میں کانپ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر میں شاخ کی طرح لرزتی رہی۔ شیشے میں مجھے اپنا عکس نظر آ رہا تھا اور میرے ماتھے سے اب بھی خون رس رہا تھا۔

تمہارے خال و خد کی سیگی پر
کسی دن سوچ کر جملہ لکھیں گے

جدید نظم وغزل کے نامور شاعر
عامر سہیل کا تازہ شعری مجموعہ
کچھ طائر پنکھ گراتے ہیں
مکمل اہتمام کے ساتھ شائع ہو گیا ہے

انتساب: عطاء الحق قاسمی
دیباچہ: محمد اظہار الحق
آراء: ڈاکٹر خورشید رضوی، امجد اسلام اسلام

ملنے کا پتہ:
بک ہوم
بک سٹریٹ 46- مزنگ روڈ، لاہور پاکستان

افسانہ

آؤ چاند کو چلیں

دستگیر شہزاد

آنکھیں بند کر لینے کے بعد بھی میں اپنے اردگرد کی ہر چیز کو دیکھ سکتی ہوں۔ مستطیل صوفہ جو کمرے کی دیوار کے سہارے اس کونے سے اُس کونے تک پھیلا ہوا ہے۔ دیواروں پر شیلف، چھوٹی سی میز، قالین پر رنگین کشن۔ حتیٰ کہ کھڑکیاں بھی جو ہم نے بلا پردوں کے چھوڑ رکھی ہیں۔ دوسرے کمرے میں ایک کشادہ صوفہ ہے۔ آئینے سے مرصع میز، دیوار میں جڑی الماری اور دو مخملیں کرسیاں رکھی ہیں۔ شادی کے دن سے اب تک ہم نے اپنے چھوٹے سے کمرے میں کسی چیز کو تبدیل نہیں کیا۔ میں نے کسی بھی چیز کو یہاں سے منتقل کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

اپنے شوہر کو یہ بڑبڑاتے سن کر کہ صبح ہو گئی ہے اور شہر بھر میں شاید ہم ہی دو جاگ رہے ہیں۔ میں نے ذرا کی ذرا اپنے پپوٹوں کو کھولا۔ پھر اُسے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا۔ جہاں صبح کی روشنی اس کے پورے چہرے اور اس کے ننگے جسم پر اپنی چاندنی بکھیر رہی تھی۔ مجھے اس کے ننگے جسم سے عشق ہے۔ میں نے پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔ اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔ جہاں سے میں اس کے جسم کے ہر ذرے اور باریک ترین تفصیل کو دیکھ سکتی تھی۔ اس کے صد کم بال، پیشانی، ناک، ٹھوڑی، گردن پر تنی ہوئی رگیں، سینے پر پریشان اس کے بال، اس کا پیٹ، اس کے پیر، حتیٰ کہ اس کے ناخن بھی۔ میں نے آواز دی کہ وہ لوٹ آئے اور میرے پہلو میں پسر جائے کہ میں اُسے چومنا چاہتی ہوں۔ وہ ساکت رہا۔ مجھ سے یوں الگ ہو کر دور جا کر کھڑے ہونے کے اس انداز سے میں سمجھ گئی کہ وہ کوئی بہت اہم بات کہنے کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ اس طرح وہ بڑا ہی بے رحم نظر آتا ہے اور ایک میں تھی اُس کی ضد، سرتاسر اُس سے جھگڑنے اور بحث کرنے کے لیے میرے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ تھامے رہوں یا اُس کے کپڑوں کا لمس محسوس کروں۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تکیے کو جسے میں بھینچے ہوئے تھی دور پھینک دیا تھا اور اُس کی قمیض کو جھپٹ کر اپنے سینے پر پھیلا لیا۔ پھر میں نے چھت کو گھورتے ہوئے اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے دریا نظر آ رہا ہے۔

''ہاں، نظر آ رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا کہ کیسے رنگ کا ہے؟

''ایک طرف گہرا نیلا'' اس نے کہا اور دوسری طرف سفیدی مائل سرمئی۔

میں نے پوچھا کہ سرو کے درخت کیا اب بھی وہیں ہیں۔

ہاں بالکل۔ میں نے کہا کہ مجھے کھجور کے اس تنہا درخت سے والہانہ عشق ہے جو ہمارے یہاں سے دیکھو تو دریا کے بیچوں بیچ گڑا نظر آتا ہے اور سرو میرے ذہن میں سفید قبروں کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ وہ دیر تک خاموش رہا اور میں چھت کو مسلسل گھورے گئی۔ پھر اُس نے کہا مرغ اذان دے رہے ہیں اور میں نے فوراً اُسے بتایا کہ پرندوں میں مرغ مجھے ذرا پسند نہیں کہ یہ فضا میں اُڑنے سے قاصر ہیں۔ جب میں بچی تھی تو انہیں گھر کی چھت پر لے جا کر فضا میں چھوڑ دیا کرتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید اس طرح انہیں اُڑنا سکھا سکوں اور یہ مرغ مرغیاں دھب سے زمین پر ایک ڈھیر کی شکل میں جا پڑتے تھے۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا سامنے والی کھڑکی میں اُسے روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے باوجود شہر بھر میں صرف ہم ہی دو بیدار ہیں۔ صرف ہم ہی دو جنھوں نے تمام رات ایک دوسرے کی بانہوں میں اُلجھے بسر کی ہے۔ وہ بولا کہ اُس کا منہ خشک ہو رہا ہے اور وہ ایک سیب چاہتا ہے۔ میں نے اُس کی خواہش کو نظر انداز کر دیا اور بولے چلی گئی کہ جب وہ ساتھ ہو تو مجھے ذرا پروا نہیں ہوتی کہ کہاں ہوں۔ زمین اپنے درختوں، پہاڑوں، ندیوں، حیوانوں اور انسانوں سمیت میرے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔ مزید انتظار کی تاب نہ لا کر استفساراً پھٹ پڑا۔ تم مسلسل بچے کی پیدائش سے انکار کیے جا رہی ہو۔ آخر کیوں؟

میں اُداس ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے

میرا دل پوری شدت سے بھینچ دیا ہو۔ آنسو میری آنکھوں میں بھر آئے۔ مگر میں نے زبان نہ کھولی۔ شادی کیے ہمیں کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟ اُس نے پوچھا میں نے ایک لفظ نہ کہا۔ صرف آنکھوں سے اُس کا تعاقب کیے گئی۔ اُس نے سرد مہری سے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ شادی کیے ہمیں ایک سال اور چند ماہ ہو چکے ہیں اور تم ہو کہ مسلسل انکار کیے جا رہی ہو۔ حالانکہ شادی سے پہلے تمھیں بچوں کا جنون تھا۔ تم ان کے لیے مری جا رہی تھیں۔

وہ ڈگمگایا اور صوفے پر ہاتھ مارتے ہوئے برس پڑا۔ اے کرسی! کیا تجھے اس کی التجائیں یاد نہیں؟ اور اے روشنی! کیا تو نے اس کی گریہ وزاری نہیں سنی تھی؟ اور اے تکیو! کتنی ہی بار کیا اس نے تمھیں ننھے بچوں کا نعم البدل سمجھ کر اپنے سینے سے چمٹائے طویل راتیں بسر نہیں کی تھیں؟ بولو اے جامد چیزو، جواب دو! اسے اس کی وہ آواز جو تم میں غرق ہو چکی ہے لوٹا دو!

میں نے نرمی سے کہا کہ جمادات احساس اور آواز سے عاری ہوتے ہیں اور یہ تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ مردہ ہیں؟ اس نے غصے سے پوچھا میں نے جواب دیا کہ اشیا مردہ نہیں ہوتیں لیکن یہ لوگ ہی ہیں جو انھیں ان کی دھڑکن عطا کرتے ہیں۔ اُس نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ میں ان اشیا کی بابت کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ میں ہمیشہ اس مسئلے کے حل کی تلاش سے بھاگتی رہی ہوں لیکن آج وہ مجھے فرار نہیں ہونے دے گا۔ خالی خالی ذہن کے ساتھ میں نے تشریحاً کہا کہ میرے اردگرد چیزیں یہ صوفہ، یہ قالین، دیوار، یہ شیلف اور یہ چھت وہ وسیع آئینہ نہیں جس میں مجھے باہر کی دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔ باہر کی دنیا کا جو مکانوں، دریا، درختوں، آسمان، سورج، ستاروں اور بادلوں پر مشتمل ہے۔ ان سب میں میں اپنا ماضی دیکھتی ہوں۔ درد اور افسردگی کی ساعتیں۔ ملاقات اور خواہش اور لذت کے لمحے جن کے سہارے آج مجھے آنے والے دنوں کا تصور ملتا ہے۔ میں انھیں ہرگز تج نہ دوں گی۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخا۔ وہی گھوم پھر کر اشیاء کا جھگڑا شروع کر دیا اور یہ بھی کہ میں ابھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم بچوں کی پیدائش سے کیوں انکار کرتی ہو؟ مزید برداشت کی تاب نہ لا کر میں چیخ اٹھی کہ کبھی خود اس نے بھی بچوں کی پیدائش سے انکار کیا تھا۔ وہ خوش رہا لیکن بس تھوڑی ہی دیر کے لیے پھر بولا۔ میں نے انکار کیا تھا تو شادی سے پہلے۔ اُس وقت جب بچوں کا ہونا نری حماقت ہوتا۔ میں نے طنزاً کہا کہ ساری بات یہ تھی کہ وہ ان سے خائف تھا۔ وہ دوسرے، وہ شہر بھر کے شہدے کہ وہ ان سے ان کی اجازت اور موافقت کے لیے گزارش کیا کرتا تھا۔ تاکہ وہ مجھ سے اور میں اُس سے مل سکوں۔ تاکہ وہ مجھے اپنی بانہوں میں بھر سکے اور میں اُسے اپنی بانہوں میں۔ تاکہ میں ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی محبت میں غرق کر سکیں۔ یہ وہ تھے جو ہمارے لیے ہماری ملاقاتوں کی جگہوں اور وقت کا تعین کیا کرتے تھے اور میں انھیں تنہائی میں اپنی محبت کا مذاق اُڑاتے دیکھا کرتی تھی۔

اُس نے گھٹی گھٹی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا میں دوسروں کی کب پروا کرتا ہوں۔ میں ایک اور عورت سے بندھا ہوا تھا۔

آہ! میں آخر کس طرح یہ عذاب برداشت کر سکتی ہوں۔ یہ تمام جنون مجھے اس سے کہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی بزدلی کا اعتراف کیا کرتا تھا کہ اُسے اس سے محبت نہ رہی تھی۔ نہ ہرگز کبھی ہو سکے گی۔ اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا تھا کہ اُس کے لیے یہ آسان نہیں کہ اب وہ اتنا بے اعتنا اور پتھر دل نہیں کہ دوسرے انسان کو جس کو گزشتہ نو برس تک ہر صبح اُٹھنے پر اُس نے اپنے پہلو میں پایا تھا۔ اُس نے اٹھ کر، اس کی آنکھوں میں گھور کر یہ کہہ سکے۔ بس تماشا ختم اور پھر منہ موڑ کر چل دے۔ میں اُداس اُداس مسکرا دی۔ اس حال میں اس کی قمیض کھینچ کر اپنے سینے پر پھیلا رہی تھی اور میرا چہرہ اُس میں ڈوب کر اُس کی مردانہ بو سونگھ رہا تھا۔ میں نے التجا کی کہ وہ میرے کچھ اور قریب آ جائے اور مجھے اپنے ہاتھ تھام لینے دے کہ میں انہیں تھامنے کی خواہاں ہوں۔ مگر وہ دور کھڑا رہا۔ جامد، بے حس بلکہ اُس نے بسرعت مجھے متہم کیا کہ میں اُس سے حاملہ ہونے کی مستقل منکر ہوں کہ وہ اس انکار کے پیش نظر یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ مجھے اب اُس سے محبت نہیں رہی۔

کیا؟ میں تڑپی۔ میں نے چیخ کر کہا کہ یہ طعنہ وہ مجھے ہرگز نہیں دے سکتا۔ کل رات ہی کو لے لو۔ میں اُس کے پہلو میں پڑی تھی اور وہ گہری نیند میں تھا۔ جبکہ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں اپنے رُخسار سے اس کی تھوڑی رگڑ رہی تھی۔ اس کا سینہ چوم رہی تھی۔ اس کی بانہوں میں حرارت کے لیے بھینچی پڑی تھی اور بے کار سی نیند کی متلاشی تھی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اُس کا یوں پلک جھپکتے سو جانا

اور میرا یوں ماہی بے آب اس کے پہلو میں پڑے تڑپتے رہنا میرے لیے کس قدر اذیت کا باعث تھا۔
اُس نے فوراً مجھے جھٹلاتے ہوئے کہا کہ راتوں میں کوئی ایسی رات یاد نہیں جو میں نے جاگ کر گزاری ہو اور اُسے یقین ہے کہ اس کے سوتے ہی میں بھی سو جاتی ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ یہ پہلی بار نہ تھی جو اُس نے مجھے یوں اپنے پہلو میں بیدار اور اکیلا چھوڑا تھا۔ پھر میں نے گزشتہ شب کا واقعہ پورے کا پورا سنایا۔ کس طرح وہ سو رہا تھا۔ کس طرح اس کا تنفس نرمی سے آ جا رہا تھا۔ جبکہ میں اس کے پہلو میں پڑی اس کی محبت میں گم تھی۔ میں نے چادر سے ایک پاؤں کو اچانک پھسلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اپنے پاؤں سے اُسے ہلانے کی کوشش کی۔ مگر وہ دوسرا پاؤں ٹس سے مس نہ ہوا اور ایک سرد لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ میں نے اُسے ہلانا چاہا لیکن وہ ساکت ہی رہا۔ پھر میں نے اپنے چہرے کو اُس کے بالوں میں دفن کر دیا تھا۔ میں خوف زدہ تھی۔ پھر وہ ہلا تھا اور ساتھ ہی اس کا پاؤں بھی۔ دبی دبی سی آواز میں اُس نے کہا تھا۔ اس زمانے میں لوگ محبت کی وجہ سے نہیں مرتے۔ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے فوراً جواب دیا کہ پھر یہ بھی درست ہے کہ اس زمانے میں لوگ بچے نہیں جنتے!
پرانے زمانے میں لوگوں کو علم ہوا کرتا تھا کہ بچہ کہاں پیدا ہوگا۔ کس سے مشابہ ہوگا، لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ وہ اس کے لیے موزے بنتے، وہ اس کے کپڑوں کے حاشیوں پر، کالروں اور جیبوں پر کشیدہ کاری سے رنگین پھول اور چڑیاں بناتے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ وہ اسے کس سکول میں پڑھنے بھیجیں گے اور یہ بھی کہ وہ کس پیشے کے لیے تعلیم حاصل کرے گا اور یہ بھی کہ وہ کس شخص سے محبت کرے گا۔
وہ بولا کیا تم اور میں مل کر بچے کی حاجتوں کو پورا نہیں کر سکتے؟ ضرب کی شدت کو کم کرنے کے خیال سے میں بول اُٹھی کہ وہ عورت جو اپنے مرد سے ناآسودہ ہو۔ نہایت بے تابانہ اشتیاق سے بچے کی خواہش کرتی ہے۔ تاکہ اپنی دنیا میں سمٹ جائے اور اپنے بچے کے وجود سے مسرور ہو کر خود کو آزاد محسوس کرے۔ اُس نے فوراً قطع کلام کیا تو کیا تم ناآسودہ تھیں؟ میں نے جواباً کہا کہ ہم دونوں ہراساں تھے۔ ہم نامعلوم گزرگاہوں کی انتہا تک کبھی سفر نہ کر سکے تھے۔ ہم خوف سے لرزاں تھے اور ہم ہمیشہ اجنبی چہروں سے ٹکراتے رہے ہیں۔ اس لیے اپنے لیے میں نے موت کا مقابلہ کیا ہے۔ تاکہ زندہ رہ سکوں۔ وہ غلطی پر ہے۔ وہ محبت جو مجھے اس سے ہے اُس پر شک کر کے وہ غلطی کر رہا ہے۔
کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ بڑبڑایا۔ میں تمھیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں حملہ آور ہوئی اور بولی کہ ساری مصیبت کی جڑ اس کی یہی نافہمی ہے اور اگر میں نے اُسے بتا بھی دیا کہ مجھ میں حاملہ ہونے کی جرات نہیں اور میں ایسی غلطی کی مرتکب کبھی نہ ہوں گی۔ تو یہ بھی وہ نہ سمجھ سکے گا۔
”غلطی“ وہ چیخا۔ میں اس کی قمیض سے اور چمٹ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ بہت ہی مدھم لہجے میں میں نے اُسے بتایا کہ میں اس بچے کی قسمت کے بارے میں کس قدر خوف زدہ ہوں جسے ہم اس دنیا کی زینت بنائیں گے۔ آخر میں کس طرح تصور کر سکتی ہوں کہ میرا بچہ، ایک وجود جس نے میرے خون سے غذا حاصل کی ہو۔ اپنی کوکھ کے اندھیروں میں جسے میں نے چھپائے رکھا ہو۔ مستقبل میں ایک دن وہ مجھے اپنے پیچھے چھوڑ کر، راکٹ میں بیٹھ کر چاند پر جا بسے گا؟ اور کسے معلوم کہ وہ خوش بھی رہ سکے گا یا نہیں۔ میرے تصور میں میرا بچہ سفید رنگوں میں سج کر آتا ہے۔ وہ دیر تک خاموش رہا۔ دریں اثنا جسم کا اُجالا اس کے چہرے سے چھن کر کمرے کے گوشوں میں پھیلنے لگا اور اُس کا چہرہ کسی تاثر سے خالی تھا اور وہ دور کھڑکی سے باہر پھیلی ہوئی فضا میں یونہی خالی پن سے اور ایک ننھے سے چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا۔
میں خود بھی خاموش تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اُسے اپنے بے حد نزدیک پا کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور میں نے بڑبڑاتے ہوئے اُس سے کہا کہ مجھے اُس کے برہنہ جسم سے والہانہ محبت ہے اور جب وہ اُس جسم کو کپڑوں سے ڈھک دیتا ہے تو مجھے بے حد اجنبی لگتا ہے۔ وہ اجنبی جو ہمارے گھر کوئی مہمان آیا ہو۔ اُس نے اپنی بانہیں وا کر دیں اور مجھ پر جھک گیا۔ میں جلدی سے اُس کی بانہوں میں سمٹ آئی اور دیوانگی سے بڑبڑانے لگی۔
مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔
مجھے تم سے محبت ہے اور اُس کی سرگوشی میرے بالوں میں چھن کر اُبھری۔
تم میرا موتی ہو۔ پھر اُس نے اپنی ہتھیلی میرے لبوں پر پھیلا دی اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنے حلقے میں کچھ اور تنگ کرتے ہوئے کہا آؤ چاند کو چلیں..... تم اور میں!

افسانہ

نفرت

نسیم سکینہ صدف

دو جسم ایک جان! فاریہ فاخر کے لیے بنی تھی اور فخر فاریہ کے لیے۔ قرب اُن کا مقدر تھا۔ وہ دوری کے نام سے بھی نا آشنا تھے۔ وہ پہروں ایک دوسرے سے باتیں کرتے اور وقت سے تیز رفتاری کا گلہ کرتے۔

آج شام صرف فاخر بولنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ فاریہ سے جسموں کی روحوں کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شاید آج یہ اپنے من کا کوئی پرانا قرض چکانا چاہتا تھا۔ فاریہ حیران تھی۔ وہ کبھی کبھی بے معنی سی مسکراہٹ اپنے لبوں پر لاتی۔ کبھی آنکھوں سے خاموش ردِعمل ظاہر کرتی۔ فاخر، فاریہ کی حیرانی اور خاموشی کو نظر انداز کر کے بولے جا رہا تھا۔ یہ مدتوں پرانی بات ہے۔ چوہدری عبدالکریم کا ایک بیٹا تھا۔ چوہدری وسیم، چوہدری وسیم ماں کا دُلارا۔ باپ کا لاڈلا سات بہنوں کا چہیتا۔ گھر بھر کا پیار اور جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں جوا، شراب اور عورت اُس کی زندگی میں ایسے نمایاں نظر آتے تھے۔ جیسے کسی سہاگن کی مانگ میں سیندور تعلیم سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

چوہدری عبدالکریم نے اُس کی زندگی سنوارنے کے لیے سختی کرنا چاہی تو ماں کی ممتا کے باعث ہر کوشش ناکام ہوئی۔ باپ پر فالج کا حملہ ہوا۔ وہ تو بیٹے کو اور آزادی ملی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حویلی نت نئی پریشانیوں میں گھر گئی۔ شادی کے بغیر سدرہ وسیم کے بیٹے دانیال کی ماں بن گئی۔ بہنوں کے سسرالیوں نے جائیداد کے تقاضے شدت سے شروع کیے۔ ممتاز کی دیوار میں دراڑیں پڑیں اور باپ کی بے زبانی بھی نشتر بننے لگی۔ اپنے چاروں طرف اندھیرا دیکھ کر چوہدری وسیم روشنی کے لیے کوئی روزن بنانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ وہ روشنیوں کے شہر نیویارک میں پہنچا تو اُسے ایک نئی دنیا نظر آئی۔ محنت، دولت اور تنہائی کی دنیا۔ اوروں کی طرح وہ بھی کام کی چکی میں دن رات پسا۔

موسموں کی شدّت کا شکار رہا۔ ایشیائی ہونے کے طعنے سنے اور کسی بے درد پتھر کی طرح لڑھکتا پھرا۔ جٹ خون تھا حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کرتا رہا اور ایک دن ایک بڑے سے کار شوروم کا مالک بن گیا۔ چوہدری وسیم کے گھر میں ماریہ آئی تو اس کے دن رات بدل گئے۔ ایک گوری بیوی اور دو بچوں نے اُس کی تنہائی ختم کر دی۔ اُس نے بیمار باپ کو بلا کر علاج کروایا۔

حویلی میں پھر سے بہار آ گئی۔ ماں باپ بہنیں اور ان کے سسرالی وسیم کے گن گانے لگے۔ چوہدری عبدالکریم پھر سے سینہ تان کر چلنے لگے۔ نور پور پرانے چوہدری وسیم کا نہیں۔ امریکا میں رہنے والے ایک امیر بیٹے کا چرچا ہونے لگا۔ یہ سلسلہ بھی عارضی ثابت ہوا۔ چوہدری وسیم ایک بار پھر جوئے شراب اور عورت میں کھو کر اپنا ماضی تلاش کرنے لگا۔ ہارٹ اٹیک نے وسیم کی جان لے لی۔ نور پور میں جنازے میں شریک چاروں طرف سدرہ خاموشی سے بیٹھی۔

دس سالہ دانیال کے چہرے میں وسیم کا چہرہ تلاش کر رہی تھی۔ کبھی اُس کی نظر اُس کھیت کی پگڈنڈی کی طرف اُٹھ جاتی جو چلتے چلتے اچانک ایک گھنے جنگل میں ختم ہو جاتی تھی۔

وہ جنگل جس میں روشنی کا گزر نہ تھا۔ وہ جنگل جس میں تنہائی تھی اور ایک راز خزاں رنگوں اور خوشبوؤں کو کھا گیا۔ کسی زرد خشک پتے کی طرح چوہدری وسیم کی روح نور پور اور نیویارک کے ماحول میں بھٹکنے لگی۔ ماں جی روزانہ وسیم کی بڑی سی تصویر پر پھول چڑھاتیں۔ سدرہ ماں جی کے پاؤں داتی۔ دانیال زمین پر بیٹھا روکھی سوکھی کھاتا نظر آتا۔

بیگم چوہدری وسیم اپنے نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ خوش تھیں۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں اور جتنی باتیں تھیں اُتنے خنجر تھے۔ وسیم کی روح اور بے قرار ہوئی جب سدرہ قتل ہو کر اس دنیا سے اُس دنیا میں چلی گئی۔

اور دانیال ننھیال کی ذمہ داری ٹھہرا۔ اُس دن حویلی والوں نے ماں جی کی خشک آنکھوں میں دو تازہ آنسو دیکھے تھے۔ ایک آنسو وسیم کے لیے تھا اور دوسرا آنسو شاید دانیال کے لیے تھا کہ اب ان دونوں کے چہرے ایک جیسے ہی لگنے لگے تھے۔ وسیم کی روح نے تڑپ کر ایک دعا مانگی۔ اے اللہ! مجھے دوبارہ زندگی عطا کر تاکہ میں سدرہ و دانیال اور ایسے ہی دیگر معصوموں، مظلوموں کی مدد کر سکوں۔ کہانی روک کر فاخر نے فضا میں آنکھیں گاڑ دیں۔ پھر فاریہ کے دونوں کاندھوں پر اپنے مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ڈارلنگ! ہم دونوں ایک سال تک ڈاکٹرز بن جائیں گے۔ پھر ہم دونوں مل کر معصوموں اور مظلوموں کی مدد کیا کریں گے۔ فاریہ نے خود کو فاخر سے آزاد کرایا۔ اعتماد کے ساتھ اُٹھی۔ باہر کی جانب بڑھی اور پلٹ کر فاخر کی طرف دیکھا۔ جنگل کی جانب جانے والی پگڈنڈی کی آنکھوں میں اس بار التجا نہیں نفرت تھی۔

افسانہ

براقش

اورنگ زیب ملک

براقش نے جس دن جنم لیا اس کی نانی رگھو کے ڈیرے پر ایک کھولی میں مری ہوئی پائی گئی تھی۔ اردگرد کے گھروں میں رہنے والے سارے جمع ہو گئے تھے لیکن مرنے کی وجہ کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔ مخصوص آوازوں کے ساتھ جہاں سبھی نے واویلا کیا وہیں براقش کے ابو نے اس کی پیدائش کو منحوس خیال کرتے ہوئے منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ اس کے ذہن پر براقش کی منحوسیت کے دھندلے سائے اس سے نفرت کا باعث بن چکے تھے۔ کیونکہ اسے براقش کی نانی سے خصوصی لگاؤ تھا اور براقش نے پیدا ہوتے ہی نانی کی جان لے لی تھی۔ براقش کی ماں اس امر سے بخوبی آگاہ تھی اور وہ بھی گاہے بگاہے براقش کے ابو کے ساتھ رگھو کے ڈیرے والی کھولی کے پاس منہ اوپر کر کے مخصوص آواز میں کچھ اظہار کرتی اور اگر براقش ان کے ساتھ ہوتی تو دونوں کی نگاہوں میں اس کے لیے نفرت کا شدید اظہار ملتا جسے بڑی ہوتی ہوئی براقش خوب خوب محسوس کر رہی تھی۔

گھر کے دونوں بڑوں کی نفرت آمیز نگاہوں سے گھبرا کر براقش اکثر باہر نکل جاتی۔ اس کے ہم عمر ساتھی کھیلتے ہوئے جب اس کا نام بگاڑ بگاڑ کر بولتے تو اسے بہت برا لگتا۔ وہ ان کے اس رویے سے بگڑ کر سڑک سے آگے والی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی سرکنڈوں کے جنگل میں گھس جاتی۔ اسے سرکنڈے اپنے ہم عمروں سے اچھے لگتے اور آہستہ آہستہ وہ اپنے ہم عمروں سے زیادہ سرکنڈوں سے دوستی کرنے لگی لیکن کب تک وہاں رہتی آخر اُکتا کر پھر اپنے ہم عمروں میں آ کر بیٹھ جاتی۔ اس کے اس اکیلے پن کو ایک نچلے درجے کے ہم درد نے محسوس کر لیا تھا اور وہ اس سے ہمدردی جتانے لگا۔ شکل وصورت بھی اس کی بھلی تھی اور وہ براقش کو بھی اچھا لگنے لگا تھا۔ براقش جب بھی گھر سے نکلتی تو رستے میں اپنے ہم درد کو منتظر پاتی جو اس کے ساتھ اپنے ہم عمروں میں جانے کی بجائے اسے سرکنڈوں کے جنگل کی طرف لے جاتا اور وہ گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ مشغول رہتے۔

ہمدرد نے اسے اپنی صلاحیتوں کا گرویدہ کر لیا تھا۔ ہمدرد چرندوں، پرندوں، درختوں اور پودوں کی زبانوں کا علم بھی جانتا تھا۔ اس نے براقش کے سامنے اس امر کا اظہار کیا تو وہ بضد ہو کر یہ علم جاننے پر اصرار کرنے لگی۔ ہم درد شاید کچھ زیادہ ہی نرم دل تھا کہ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اسے یہ علم سکھا دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ براقش کو اب ہمدرد سے زیادہ دوسری ذی روحوں اور ان کی زبانوں میں دلچسپی ہو گئی تھی اور وہ اب آہستہ آہستہ ہم درد سے دور رہنے لگی جس کو ہم درد نے بھی بخوبی محسوس کر لیا تھا۔ اب وہ کئی کئی گھنٹے نہ تو ہم عمروں میں بیٹھتی اور نہ ہی ہم درد کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی۔ زبانوں کا علم جاننے سے اس نے سرکنڈوں کی باتیں سننا شروع کر دیں اور ایسے سرکنڈے دوست بنا لیے جنہیں سرکنڈوں کا ایک اور گروہ ناپسند کرتا تھا۔

ایک دن براقش جب سرکنڈوں سے مل کر واپس آ رہی تھی تو ہمدرد اس کی راہ میں بے چین کھڑا تھا۔ براقش قدرے افسردہ دکھائی دے رہی تھی وجہ پوچھنے پر اس نے ہمدرد کو بتایا کہ پہلے تو صرف ہم عمر اسے اس کے نام سے چھیڑتے تھے اب سرکنڈے بھی اس کا نام لے کر اسے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس نے رو رو کر ہمدرد سے پوچھا کہ اس کے نام براقش کے کیا معنی ہیں۔ ہمدرد کو خود معلوم نہ تھا لیکن اس نے کسی سے پوچھ کر بتانے کا وعدہ کیا۔ براقش اس کے وعدے سے انتہائی خوش تھی۔ جبکہ دوسری جانب اپنے نام سے ہونے والی نفرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کس مخلوق کی کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی کیا ہیں؟ وہ ہمدرد سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بانٹ چکی تھی اور کئی دن تک ہمدرد کی جانب سے جواب کی منتظر رہی جو کہ اب اس کو دیکھ کر کنی کترانے لگا تھا اور اسے دور سے دیکھ کر ہی بھاگ جاتا۔ ہمدرد اور براقش کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں نے ایک نئے ہم نوا کے لیے براقش کے قریب ہونے کا راستہ ہموار

کر دیا تھا جس نے چند ہی دنوں میں براقش کو اپنی جانب متوجہ کر لیا اور روز بروز دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔

براقش نے ایک دن ہم نوا کو بھی اپنی زندگی کے سب سے بڑے دکھ میں ہم راز بنا لیا اور اس سے براقش کے معنی پوچھے لیکن دیگر سب کی طرح اسے بھی براقش کے معنی معلوم نہ تھے۔ ہم نوا نے اسے اپنے ایک دوست بوڑھے برگد کے متعلق بتایا جو سب کچھ جانتا تھا لیکن بوڑھے برگد کا گھر بہت دور جنگل میں تھا۔ ہم نوا نے براقش سے وعدہ کیا کہ وہ جب بھی جنگل کی جانب گیا تو بوڑھے برگد سے اس بارے میں بات کرے گا جبکہ براقش بضد تھی کہ وہ اسے جلد از جلد معنی سے آگاہ کرے۔ کیونکہ ارد گرد کے سب دوست دشمن اسے منہ اور شکلیں بگاڑ کر نہایت گندے انداز میں اس کے نام سے پکارتے ہوئے ہنسنے لگتے تھے جس پر وہ زچ ہو جاتی تھی۔

آج براقش نہایت افسردہ تھی۔ اس کی ماں بیمار تھی اور کئی دنوں سے بھوکی بھی تھی۔ براقش نے سیدھا سرکنڈوں کے جنگل کا رُخ کیا۔ وہ اپنے دوست سرکنڈوں کے پاس گئی جنھوں نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ بھی شاید اس سے نالاں تھے۔ براقش نے ایک دوست سرکنڈے کو ماں کی بیماری کا بتایا تو اس نے ایک بوٹی کے متعلق بتایا جو ماں کو کھلانے سے اس کی بیماری دور ہو سکتی تھی لیکن یہ بوٹی سرکنڈوں کی جڑوں کے اندر چھپی ہوئی تھی جسے ڈھونڈنے کے لیے براقش نے اگلے پاؤں کے ناخنوں سے ہر سرکنڈے کی جڑوں کو کھودنا شروع کر دیا۔ سرکنڈے مرجھاتے چلے گئے اور بالآخر ایک سرکنڈے کی جڑوں کے پاس اسے بوٹی مل گئی جس کے ساتھ تازہ تازہ گوشت کا ایک ٹکڑا بھی موجود تھا۔ براقش نے اس بوٹی اور گوشت کو اٹھایا اور رگھو کے ڈیرے کے پاس جا کر نانی کی کھولی میں بوٹی کو گوشت پر اچھی طرح لگا دیا۔ ماں کو یہ سب کچھ کھلا کر براقش مطمئن تھی کہ ماں اچھی ہو جائے گی لیکن اگلی صبح اس کی ماں نے زمین پر تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ براقش اب ماں کے بغیر اکیلی رہ گئی تھی اور اس کا باپ نفرت بھری نگاہوں سے براقش کی جانب دیکھتے دیکھتے گنگ ہو گیا تھا۔ براقش اپنی ماں کی موت کا ذمہ دار خود کو سمجھنے لگی اور ان حالات میں ہم نوا پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے اس نے دور کے جنگل کے بوڑھے برگد کے پاس خود جانے کی ٹھان لی تاکہ اپنے نام کے معنی معلوم کر سکے۔

راستہ میں اس کا گزر سرکنڈوں کے جنگل سے ہوا۔ سرکنڈے مرجھا چکے تھے کیونکہ براقش نے بوٹی کی تلاش میں سرکنڈوں کو جڑوں سے کاٹ ڈالا تھا۔ لمبا سفر کر کے جب وہ دور کے جنگل میں پہنچی تو بوڑھا برگد سو گیا تھا۔ شام کے اندھیرے میں براقش نے ہر طرف نظر دوڑائی ہر ذی روح اس کی جانب پشت کر کے کھڑا تھا ہر ایک اس سے ناراض لگتا تھا۔ بڑی مشکل سے براقش نے وہاں رات گزار کر صبح بوڑھے برگد سے براقش کے معنی جاننے کا انتظار کیا اور جونہی صبح ہوئی وہ بوڑھے برگد کے قریب گئی۔ بوڑھے برگد پر نزع کا عالم شروع ہو گیا۔ براقش نے بوڑھے برگد سے رو رو کر درخواست کی کہ وہ اسے براقش کے معنی بتا دے۔ نزع کے عالم میں بوڑھے برگد نے براقش کے کان میں براقش کے یہ معنی بتاتے ہوئے کہ عربی زبان میں براقش اُس کتیا کو کہتے ہیں جو اپنے مالکوں اور قبیلہ کو بھی کھا جاتی ہے دم توڑ دیا۔ بوڑھا برگد بھی براقش کی نذر ہو گیا تھا اور براقش چاروں پاؤں بھاگتی ہوئی مرجھائے سرکنڈوں کے پاس سے گزری تو اسے سارے ہم عمر ہمدم گرد، ہم نوا اور ہم راز زمین پر لوٹتے نظر آئے۔ نظر بد نے ان کو بھی آ لیا تھا۔ براقش جب رگھو کے ڈیرے کے پاس کھولی میں پہنچی تو اس کا باپ......

پنجابی شاعری وچ

سوہنیاں نظماں دا سوہنا اضافہ

اجمل خیال کی پنجابی شاعری کا مجموعہ

وِدھوا رنگی مانگ

ملنے کا پتہ:

بک ہوم، لاہور 0301-4568820

کویت میں مقیم اُردو پنجابی کے معروف شاعر

بدر سیماب کا شعری مجموعہ

تمھیں سوچا تمھیں چاہا

طباعت کے آخری مراحل میں ہے

افسانہ

گردشِ دوراں

رانا محمد یعقوب

اور اب...... اب میں ایک سرد خاموشی کے ساتھ، بس دیکھتا رہتا ہوں اور چلتا رہتا ہوں۔ ہستی انساں اور گردشِ دوراں...... آنکھ کے تل میں سمٹ جانے والی مگر ہر آن پھیلتی اور معدوم ہوتی۔ ارض کائنات کے تماشے کو...... کہ اب دیکھنے اور دیکھتے ہی رہنے کی کوئی حد ہی نہیں رہی۔ حد ادراک سے پرے اور پس باطن...... حال، ماضی اور مستقبل، ہمہ وقت آنکھ کے سامنے مجسم رہتے ہیں...... اور میں بس دیکھتا رہتا ہوں اور چلتا رہتا ہوں کسی پرسکوت کلس پر ذرا ٹھہر کے شہر کو دیکھوں تو عمارتوں کے بیچوں بیچ اور راستوں پر انسان نما مجہول پرندوں کے غول در غول دکھائی دیتے ہیں...... اور ان کی بے سمت پروازیں...... جیسے یہ غول عافیت کی طلب میں اُڑ کر بہت دور جانا چاہتے ہوں۔ مگر فضائے شہر کی غیر مرئی جکڑن ان کو اپنے دائرے سے نکلنے نہ دیتی ہو۔ کسی گزری سطوت کے اُجڑے ہوئے گنبد سے نظارہ کروں تو شہر کی اطراف و جوانب اور بیچوں بیچ انسانی سروں کی ایسی فصل نظر آتی ہے جس کے لہلہاتے وجود میں بادِ سموم کے جھونکوں نے خوف کی لرزش شامل کر دی ہے۔ کبھی خاک کی ذروں کا ہجوم بیکراں نظر آتا ہے جو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے آزاد، اپنی دوڑ سے زندگی کی تعبیر پاتا ہے...... دوڑ...... حشرات الارض کی دانۂ رزق کے لیے...... ایسی دوڑ...... جس میں ہر کوئی دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی جستجو میں ہو یا پھر گھنے تاریک جنگل کے خارزار راستوں پر جنگلی درندوں کا جمِ غفیر...... ایک دوسرے کو پچھاڑتا ہوا سوئے آب بھاگا چلا جا رہا ہو...... اور اپنی خاموشی کو ساتھ لیے میں...... عمارتوں کے بیچوں بیچ...... راستوں پر اس بھاگ دوڑ کو دیکھتا ہوں تو نظر بے اختیار اپنے پاؤں پر جاتی ہے...... اور میرے پاؤں...... میرے پاؤں میرے ہونے کے باوجود مجھے نظر نہیں آتے......

بس یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب گردش لیل و نہار نے اجنبیت اوڑھ لی تھی اور سب موسموں نے اپنے مزاج بدل لیے تھے۔ راتیں تاریک ہو کر بینائی کو اپنا حصہ بنا لیتیں اور کبھی یوں لگتا کہ آسمان کے کنارے جل رہے ہیں۔ کناروں سے چاند کی طرف لپکتی ہوئی آگ کی تپش سے چاند اور ستارے آتش سیال میں ڈھل کر کرہ ارض کے سمندروں میں گر رہے ہیں...... اس دن بھی حشرات الارض اور مجہول پرندے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے پر اُدھار کھائے بیٹھے تھے۔ اس دن بھی آسمان کی وسعتوں میں زندگی افروز نیلاہٹ کی بجائے ایک ماند پڑتی پیلاہٹ تھی اور یہ پیلاہٹ چار سو برس رہی تھی...... نرم چاندنی کی بجائے مضطرب کر دینے والی پیلاہٹ...... اس طویل دن کی شام کو میں ہر روز کی طرح کمرے کی کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ اس کھڑکی کے ساتھ ہی ایک کھونٹی کی ایک کیل پر وہ نظریات لٹکے ہوئے تھے جن سے میری آگاہی دوران تعلیم ہوئی تھی۔ نظریات جنھوں نے دنیا بدل ڈالی۔ مگر انسان کے اندر کی نیرنگیوں کا گلا گھونٹ دیا...... اور دوسری کیل پر ازل سے ابد تک اور ازاں بعد بھی چھائی ہوئی طبقاتی زندگی...... اور تیسری کیل پر میرا سماجی ماسک پڑا تھا جسے میں نے دنیا کے بازار سے لیا تھا یا پھر دنیا نے مجھے دے دیا تھا۔

کھڑکی کے سامنے بیٹھے بیٹھے جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے اُٹھایا اور میں کمرے سے نیچے آ کر سڑک سے گزرنے والے مجہول پرندوں کے غول کا حصہ بن کر، بھیڑ کی ناک کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ بھیڑ ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جس میں شامل لوگوں کے پژمردہ چہروں پر ایک گرد و غبار سا چھایا تھا...... کسی ذی نفس کی بولی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تا حدِ نظر سر ہی سر تھے...... جیسے غلامانِ مصر کا گروہ کثیر، کوڑے کھاتا، اینٹ اور پتھر ڈھوتا...... بابل و نینوا کے راہ راست سے بھٹکے ہوئے یا شاید یوم سبت کے نافرمان یا دشت لوط کے درندے...... بھانت بھانت کے...... پتہ نہیں کیا۔ شئے ان کو یہاں کھینچ لائی تھی...... نا سمجھی...... سیاست دوراں...... یا پھر شاید کوئی عقیدہ...... کس نے اکٹھا کیا اور یہ کیوں اکٹھے ہوئے...... یہ بات میں اب بھی سوچتا رہتا ہوں۔

ہجوم کی ناک کی سمت چلتے چلتے بصارت کو چندھیا دینے والی روشنی اور سماعت پی جانے والی کسی بانگ اسرافیل نے جیسے دھرتی کو آتشیں انار کی طرح کی پھوڑ ڈالا۔ میں سمجھا شاید کوئی ستارہ ہمارے سیارے سے ٹکرا گیا ہے یا پھر نظامِ شمسی میں کوئی بہت بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہو گئی ہے۔ یوں لگا جیسے چاند کو لگی آتش سیال نے اچانک بہتی آبشار کی صورت پکڑی اور زمین...... زمین جیسے گرم تانبا بن گئی...... ہر ایک ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ ہاہا کار اور سراسیمگی کے اس عالم میں بہت سے لوگ میرے وجود سے ہوئے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ایک بھاگتے ہوئے شخص کی دوڑ کی لپٹ میں آنے سے بچنے کے لیے میں نے اپنے بازو آگے کر دیے...... مگر وہ میرے بازوؤں سے گزر کر وجود کے پار ہو گیا میں نے اس کہرام سے بچ نکلنے کی ٹھانی اور واپس پلٹا...... واپس پلٹا تو مجھے یوں لگا کہ میرا خاکی وجود اور زندگی کے تمام تر عزم عالی شان حصوں میں بٹے زمین پر تڑپ رہے ہیں...... جہاں اور لاشیں، سر بریدہ اور بدن دریدہ پڑی ہوئیں۔

اور اب...... اب سارا دن بستر نمبرے کے بم بلاسٹ برن مریض کے گرد میڈیکل کے طالب علم اپنے پروفیسرز اور ڈاکٹر صاحبان کے ہمراہ پریکٹیکل کرتے اور بم بلاسٹ برن کیس سٹڈی کرتے ہیں۔ میرا وجود سرکاری ہسپتال کی وارڈ میں ہے۔ میری روح شہر کی ہواؤں اور فضاؤں میں ہے...... اور میں...... میں ان فضاؤں میں بس دیکھتا رہتا ہوں اور چلتا رہتا ہوں، گردش دوراں اور ہستی انساں......

معین نظامی

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو رحمان اور رحیم ہے۔ جو ہمارے دونوں کو شکست و نابود کرتا ہے کہ یہی اس کی سنت ہے لیکن پھر نوحوں اور سینہ کوبی کا بندوبست کرتا ہے تا کہ در شکست و نابود ہو کر بھی محفوظ ہو جائے۔۔۔۔ معین نظامی سورج بھی ہے اور نوحہ گر بھی اور اس نے یہ دونوں کام ان دو خاصیتوں کے ساتھ کیے ہیں جن میں سے ایک بھی غائب ہوتی تو کام بگڑ جاتا اور وہ دو خاصیتیں ہیں کمالِ فن اور دانش ورانہ گہرائی۔۔۔ معین نظامی کی شاعری کی کلید اس کی لفظیات ہیں۔۔۔۔ اور ان لفظیات سے وہ ایسے ایسے تلازمے دریافت کراتا ہے کہ اگر وہ خطیب ہوتا تو سننے والوں کے منہ کھلے رہ جاتے اور حیران نظریں اس کے چہرے پر چپکی ہو جاتیں۔ یہ تلازمے وہ خود بھی تراشتا ہے اور ان سے علامتوں کا کام لیتا ہے۔۔۔۔ کلاسیکی رنگ کے ان تلازموں کے ساتھ ساتھ وہ ماڈرن Sensibilities کو بھی پوری طرح بروئے کار لاتا ہے اور اظہار کے انوکھے اسالیب Coin کرتا ہے۔ فارسی ادب کے بحرِ بے کنار پر تو معین نظامی کی حکومت کا سکہ چلتا ہی ہے اور اس نے اس بحرِ بے کنار کو اس طرح اپنی جھیل بنایا ہوا ہے جس طرح عثمانی ترکوں نے اپنے زمانہ عروج میں بحیرہ روم کو جھیل بنایا ہوا تھا لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ جب وہ اس سے باہر نکل کر ساحل پر پاؤں دھرتا ہے تو ایک اور بادشاہی اس کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔۔۔۔ قدیم و جدید کی یہ ثنویت اس کے اصل میدان یعنی محبت کی نظموں میں بھی بہ درجہ اتم موجود ہے۔ اس کی محبت کی نظموں میں اس قدر بوقلمونی اور تنوع ہے کہ بہتر ہے کہ اب ہم قدیم و جدید کی اس بحث سے باہر نکل آئیں اور حیرتوں، وسعتوں اور طلسمات کی اس دنیا میں کھو جائیں جو ایک اکائی ہے۔۔۔۔ (محمد اظہار الحق)

جادو

کسی دنیا کے نقشے میں
کوئی اچھا، بہت اچھا نگر ہے
جس میں، میں ہوں
اُس بہت اچھے نگر میں
کوئی اچھا سا، بہت اچھا سا گھر ہے
جس میں، میں ہوں
اُس بہت اچھے سے گھر میں
اک بہت اچھا سا بت ہے
جس میں، میں ہوں
اُس بہت اچھے سے بت میں
اک بہت اچھا سا دل ہے
جس میں، میں ہوں
اُس بہت اچھے سے بت کی
سرخ ڈوروں والی آنکھوں میں
کوئی اچھا سا تِل ہے
جس میں، میں ہوں

خلا

کچھ اس طرح خلا
میرے روز و شب میں ہیں
جو فاصلے سے کسی کو نظر نہیں آتے

کچھ اس طرح کے تضادات

مجھ میں یکجا ہیں
جو عقل و فہم کے زیرِ اثر نہیں آتے
مرے قریب جو آتا ہے، خوش نہیں رہتا
میں سوچتا ہوں
کہ تو جتنے فاصلے پر تھا
خوشی کے موسمِ گل رنگ میں وہیں رہتا

تمہیں کچھ ہوا تو......

تمہیں کچھ ہوا تو......
مگر بات یہ ہے، مرا دل یہ کہتا ہے
اُس کو کبھی کچھ نہ ہوگا
تمہیں کچھ ہوا تو......
مگر بات یہ ہے، مرا دل یہ کہتا ہے
تم نے یہ سوچا ہی کیوں ہے
تمہیں کچھ ہوا تو
مگر بات یہ ہے، مرا دل یہ کہتا ہے
آخر اُسے کچھ بھی کیوں ہو
تمہیں کچھ ہوا تو......
مجھے اپنے دل کی طرف سے اجازت نہیں ہے
کہ اس سلسلے میں، میں کچھ اور سوچوں

آپ ہمارا مسئلہ سمجھیں

خواب، خیال کے جنگل میں
اک ہاتھی دانت کا تاج محل ہے
صندل والی دیوی کا
جو اندھی، گونگی، بہری بھی ہے
دل کی بے حد گہری بھی ہے
اُس کے گرد فصیلیں ہیں
کچھ شیشے کی
کچھ سونے کی
کچھ چاندی کی
کچھ ہیرے کی
اُس جنگل کے اک تنگ دھڑنگ قبیلے والے
جنسی وحشی
اُس کو 'ماتا' کہتے ہیں
اور نیزوں، بھالوں، برچھیوں والے پہرے دار
فصیلوں پر ہر وقت چوکنے رہتے ہیں
اُس جنگل میں جب گندم پکنے لگتی ہے
تو پورے چاند کی آدھی رات کو
اُس کے تازہ بالغ ہونے والے لڑکے
ایک خبیث پروہت کی نگرانی میں
کچھ ڈھول ڈھمکوں کے اک خاص آہنگ پہ رقصاں
اُس کی پوجا کرتے ہیں
اب آپ ہمارا مسئلہ سمجھیں
صندل والی اُس دیوی پر
ہم مرتے ہیں

محمد ممتاز راشد/دوحہ

جتنا چاہوں خرچ کروں یہ مال نہیں گھٹنے والا　　　غم کی دولت دے کر اُس نے ایسا مالا مال کیا

ممتاز راشد کا نام ادبی دُنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ عالمی سطح پر شہرت کے حامل شاعر، ادیب، افسانہ نویس، مبصر، انشائیہ نگار اور محقق ہیں۔ وہ طویل عرصہ سے بسلسلہ روزگار دوحہ قطر میں مقیم ہیں۔ دوحہ میں اپنی ادبی تنظیم کے پلیٹ فارم سے وقتاً فوقتاً بین الاقوامی مشاعرے اور کانفرنسیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی ۱۸ کتب مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری اور نثر میں وہ اپنا الگ اسلوب رکھتے ہیں۔ تنقیدی شعور اور اعلیٰ ادبی ذوق کی وجہ سے انہیں برصغیر پاک و ہند کے نامور شعراء کے اچھے اشعار زبانی یاد ہیں جنہیں وہ ادبی محافل میں وقتاً فوقتاً سناتے رہتے ہیں۔ ممتاز راشد بحیثیت انسان بھی نہایت منکسر المزاج اور عجز کا مرقع ہیں۔ (ارژنگ)

دل پر گہری چوٹ لگی تو اُس نے ایسا حال کیا
ذہن و روح کو تڑپایا اور سارا جسم نڈھال کیا
جتنا چاہوں خرچ کروں یہ مال نہیں گھٹنے والا
غم کی دولت دے کر اُس نے ایسا مالا مال کیا
پھول کی صورت نکھرا، جس کو، ہم نے بخشی خوش رنگی
اُس کا نور مثالی ٹھہرا، جس کو چاند مثال کیا
اُس کے چہرے کی لالی سے، ملی رسید وصولی کی
آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس کو، جو تحفہ ارسال کیا
اُس کا میرے ساتھ سلوک تھا راجوں اور نوابوں سا
جب بھی چاہا خلعت بخشی جب چاہا پامال کیا
دل کہتا تھا، اُن کا دل پر ہوگا کچھ اچھا ہی اثر
خاص جواب کی آس لگائی جب پیغام ایصال کیا
کیا بتلائیں کیا گزری تھی اُن کی ایک تجلی سے
سو سو جتن کیے تو راشدؔ دل کا حال بحال کیا

دل نے جب اُس دیار کی ٹھانی
پھر کسی اور کی نہیں مانی
یاد آیا وہ دشمنِ جانی
جس کے دم سے ہے غم کی ارزانی
اس میں چہرہ ترا تھا مثلِ گلاب
اک چڑیا تھی جو تری دھانی
جس سے تو بھی نہال ہو جائے
آج کرنے دے ایسی من مانی
اس برے حال تک مجھے لائی
میرے اچھے دنوں کی نادانی
منہدم جب ہوا تھا خواب محل
چل رہی تھیں ہوائیں طوفانی
اتنا برسات میں نہیں برسا
جتنا آنکھوں سے بہہ گیا پانی
بندہ پرور نہ کیجیے احسان
ہم سے ہوگی نہ اب ثناخوانی
تم سا عاشق بھی کوئی کیا ہوگا
عشق میں ڈھونڈتے ہو آسانی
محفل غیر ہے مگر راشدؔ
ساری شکلیں ہیں جانی پہچانی

عشق میں قربت بھی ہر چند ضروری ہے
ہجر نہ ہو تو رسمِ عشق ادھوری ہے
جب دربارِ محبت میں شرکت ٹھہرے
اس میں سب سے اہم مقام حضوری ہے
میں اس شہر میں، تم اُس شہر میں ہو لیکن
دل کے پاس رہو تو کیسی دوری ہے
اُس کے چھونے سے ہوتا ہے مہک ساں
جیسے اُس کا لمس نہیں، کستوری ہے
بڑوں بڑوں میں بھی کچھ کمیاں ہوتی ہیں
کس کی ذات صفات میں بالکل پوری ہے
کل تک جو شاداب تھا، رشکِ بہاراں تھا
آج اُس رُخ پر پت جھڑ کی بے نوری ہے
بے بس لوگوں کی مجبوری کے آگے
میری یہ مجبوری کیا مجبوری ہے
راشدؔ آج ملا ہے خاص پیام اُن سے
جن آنکھوں کا رنگ ذرا انگوری ہے

مٹ گئی اس کی سب پشیمانی
جس نے اپنے ضمیر کی مانی
صرف اُسی کو کہیں گے انسان
پائیے جس میں وصفِ انسانی
آرزوؤں میں ہے تلاطم سا
بحرِ جذبات میں ہے طغیانی
میں خرابوں میں آ گیا شاید
آ رہی ہیں صدائیں انجانی
جن میں آوارگی نہ تھی ممکن
اُن دیاروں کی خاک بھی چھانی
کب کرے گا کوئی کسی کا لحاظ
مر چکا ہو جو آنکھ کا پانی
ہم پریشاں اُسے کریں کیسے
اب ہے لاحق بھی پریشانی
آپ کی شخصیت بگاڑے گی
لن ترانی ہو یا ثناخوانی

پریا تابیتا/لاہور

وقت کی طرح یہ سانسیں بھی رواں ہیں اب تک　　ایک بس اشک تھمے اور رُکا کچھ بھی نہیں

میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ پریا تابیتا خود زیادہ اچھی ہیں یا اُن کی شاعری۔ میں نے جب بھی کسی مشاعرے میں اُن کی شاعری سنی یا کسی ادبی جریدے میں اُن کی کوئی غزل پڑھی تو دیر تک اُس کے حصار میں رہا۔ پریا تابیتا کی شاعری جزیرے میں کھلے ہوئے کسی باغ کی طرح ہے جس کی مہک پڑھنے والے کے دل کے ساحل اور آنکھوں کی لہروں سے بھی آتی ہے۔ (حسن عباسی)

فیصلوں کی آڑ میں اب فاصلہ ہونے کو ہے
ابتدا تو ہو گئی تھی انتہا ہونے کو ہے
ہم نے تھا کچھ اور چاہا اور کیا ہونے کو ہے
اک ذرا سا واقعہ اب سانحہ ہونے کو ہے
پھر ہوائیں اجنبی ہیں اور سہمی ہے فضا
پھر کہیں شہرِ گماں میں حادثہ ہونے کو ہے
حاکمِ ارضِ وطن سے کیا توقع کیا گلہ
وہ خود اپنے نفس کا اب آئنہ ہونے کو ہے
بے خبر صوبوں کے وُزرا اور بے حس جانشیں
کیا پتہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہونے کو ہے
کر سکے بس یہ دھماکوں کی مذمت اب تلک
اور سمجھے فرض ان کا یوں ادا ہونے کو ہے
ہیں سراپا بد دیانت یہ خزانوں کے امیں
قوم ان کے دم سے اب دیوالیا ہونے کو ہے
زد میں ہیں اہلِ وطن اور ضد میں حاکم وقت کے
بر سر پر خاش اب ہر مرحلہ ہونے کو ہے
سب ہراساں ہو گئے بچے بڑے بوڑھے جواں
امن کا ارماں یہاں اب معجزہ ہونے کو ہے
ہم سے ہو گا وہ مخاطب معجزاتی طور پر
آج حاکم قوم کا حاکم نما ہونے کو ہے
ہر گھڑی وحشت زدہ ہیں قافلے والے سبھی
کون سا رہزن یہاں اب رہنما ہونے کو ہے

ہم ہی ٹھہرے ہیں سزاوار خطا کچھ بھی نہیں
تُو سمجھتا ہے ترے بعد ہُوا کچھ بھی نہیں
یاد جب آئی تری یاد رہا کچھ بھی نہیں
دل نے بس آہ بھری اور کہا کچھ بھی نہیں
وقت کی طرح یہ سانسیں بھی رواں ہیں اب تک
ایک بس اشک تھمے اور رُکا کچھ بھی نہیں
ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر وہ گیا ہے جب سے
مَیں نے اُس وقت سے ہاتھوں سے چھوا کچھ بھی نہیں
مجھ سے کہہ دے وہ کسی روز اچانک آ کر
میرے جیون میں ترے بعد بچا کچھ بھی نہیں
بعد مُدت کے ملا آج وہ پہلے کی طرح
اور اِس بار اُسے مَیں نے کہا کچھ بھی نہیں

کتابِ ارضی میں اِس صدی کا سیاہ کتنا یہ باب آیا
مِرے وطن کا بنا حوالہ جہاں بھی کوئی عذاب آیا
لُٹی سیاست، سیاستوں میں، بٹی حکومت، عداوتوں میں
صداقتوں کا لبادہ اوڑھے، رذیل آیا، کذاب آیا
ہماری دھرتی پہ بنتِ ارضی، جیئے زمیں پر یا قبر میں ہو
اُڑی ہیں عصمت کی دھجیاں یوں درندگی کا عذاب آیا
کہیں پہ شوہر کے ٹکڑے کر کے، ملول بنتِ بشر نہیں ہے
کہیں پہ مُردے پکا کے کھانا، عجب مقام خراب آیا
خلوص، مہر و وفا، محبت، چلن وہ امن و مفاہمت کا
جیسی یہ ساری باتیں، کسی کو جیسے ہو خواب آیا
کہیں وبائیں ہیں، آفتیں ہیں، کہیں پہ سیل بلا رواں ہے
یہاں پہ برپا ہے قہر ہر جا، چمن یہ زیرِ عتاب آیا
کہیں دھماکے، کہیں پہ گولی، کہیں پہ تاوان اور چوری
یہاں بشر ہے شرار جیسا، یہاں یہ مثلِ حباب آیا
خیال روزِ جزا نہیں ہے، کہیں بھی خوفِ خدا نہیں ہے
گُنہ نے حد سے کیا تجاوز، قریب روزِ حساب آیا
اَے پاک پروردگار، داتا، دراز دستِ سوال میرا
بنے گی دھرتی یہ تب مثالی کہ جب بھی تیرا جواب آیا

میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب ذات مِری
کچھ کی حیرت میں رہی کچھ کے سوالوں میں کہیں
میری آنکھوں میں سمٹ آئے تھے سب درد مِرے
اُلجھنیں ساری الجھ بیٹھی تھیں بالوں میں کہیں
آج معروف ہے وہ شخص مثالوں کی طرح
تُو جسے چھوڑ گیا چند حوالوں میں کہیں
میرے جیون کی سیاہی تیرے جاتے ہی گئی
ڈھونڈنا ہو تو مجھے ڈھونڈ اُجالوں میں کہیں
اب تو یادوں کا تصور بھی مِرے پاس نہیں
اب مجھے یاد کرو بھولنے والوں میں کہیں

غزالی / گوجرہ

شکریہ تو نے محبت مجھے زندہ رکھا　　سانس چلتی ہے فقط تیری نگہبانی سے

آرٹ اور جذبوں کی فراوانی جب شعر کے پیکر میں ڈھلتی ہے تو شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ جبکہ تخلیق "ہنر کی یہ ساعتیں قدرت نے غزالی کو اپنی پوری فیاضی کے ساتھ عطا کی ہیں۔ اب گوجرہ محض ایک تجارتی شہر ہی نہیں رہا بلکہ غزالی کی موجودگی سے ایک اہم ادبی منارہ بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب پاکستان میں جب بھی اہم نوجوان شعرائے کرام کا ذکر چھڑتا ہے تو غزالی کا نام دردِ دل پر دستکیں دینے لگتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غزالی نے اپنی شاعری میں شاعری کے فنی تقاضوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور کہیں بھی حرمتِ شعر پر حرف نہیں آنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ غزالی کے دریائے غزل کے دونوں کنارے موتیوں اور سیپیوں سے مزین دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کو دیکھنے کے لیے چشمِ بینا کی ضرورت ہے۔ (ارژنگ)

تمہاری یاد، پرندے، ہوائیں، دروازے
دیارِ فکر میں کھلتے ہی جائیں، دروازے
وہ خوش نصیب ہیں بیٹے نصیب ہیں جن کو
عظیم مائیں، مقدس دعائیں، دروازے
یہ بے مکانی کے شانوں پہ بے نوا لاشے
خدا کرے کبھی ان کو بلائیں دروازے
لگا رکھی ہے خدایانِ زر نے پابندی
کسی غریب پہ کھلنے نہ پائیں دروازے
سجایا جن کے ہنر نے حویلیوں میں انھیں
انھیں غریبوں کو آنکھیں دکھائیں دروازے
میں جاؤں بن میں غزالی تو کاٹے تنہائی
نگر میں آؤں تو کھانے کو آئیں دروازے

کتنی رونق ہے مگر چھت ہے نہ دروازہ ہے
کسی درویش کا مسکن ہے یہ اندازہ ہے
دربدر ہاتھ میں کشکول لیے پھرتا ہے
ایک مفلس کو ستانے کا یہ خمیازہ ہے
تیرے جانے سے اُتر آئی خزاں آنگن میں
تیرے آنے سے مگر پھول ہر اک تازہ ہے
ایسا ہونے سے شرمسار نہیں ہے کوئی
کس قدر قوم کا بکھرا ہوا شیرازہ ہے
اپنے ہونے کا بھی احساس نہیں ہے اب تو
سب کے چہروں پہ غزالی یوں لگا غازہ ہے

کتنے لوگوں نے ہیں ہاتھوں میں اُٹھائے پتھر
گھر میں بیری ہو تو ہر سمت سے آئے پتھر
اہل دُنیا کا بھی دستور نرالا دیکھا
موم کے دل ہیں گھروں پر ہیں سجائے پتھر
میں نے شیشے کی دُکاں خوب سجا رکھی ہے
یہ حقیقت ہے شب و روز ڈرائے پتھر
صدیوں پہلے کی کہیں یاد نہ ہو پھر تازہ
آسماں پھر نہ کہیں ہم پہ گرائے پتھر
کتنا عرصہ ہے لگا جسم کو پتھر بنتے
تیرے چھونے سے پگھل ہی تو نہ جائے پتھر
شہر پتھر کا مکیں بھی تو ہیں سبھی پتھر کے
کیا سبب ہے کہ مجھے راس نہ آئے پتھر
اک غزالی ہی نہیں صرف اسیروں میں ترے
کتنے لوگوں نے ترے نام پہ کھائے پتھر

وگرنہ ہم بہت کم بولتے ہیں
کہیں شر ہو تو پھر ہم بولتے ہیں
اُدھر تو خامشی ہی خامشی ہے
اِدھر تو چار موسم بولتے ہیں
جہاں کوئی نہیں ہے بول سکتا
وہاں پر ابن آدم بولتے ہیں
یہاں تو امن ہے، بارود کب ہے؟
یہاں پنچھی تو ہر دم بولتے ہیں
بھلے لگتے ہیں سرحد پر غزالی
وہ لہرا کر جو پرچم بولتے ہیں

جب سے دریا ہیں تہی میرے بھی پانی سے
کشتیاں حال بھی کہتی ہیں تو ویرانی سے
دوست، دشمن مرے کردار پہ حیران ہیں سب
دستبردار ہوا جب سے میں سلطانی سے
شکریہ! تو نے محبت مجھے زندہ رکھا
سانس چلتی ہے فقط تیری نگہبانی سے
ریگِ صحرا ہو کہ دریا کہ ہو دار کوئی
عشق پیچھے نہیں ہٹتا کسی قربانی سے
موم کرتی ہیں تری باتیں بھی میرے دل کو
کچھ عبادت بھی نظر آتی ہے پیشانی سے
سالہا سال جسے اپنا بنانے میں لگے
ذہن سے کیسے نکل پائے گا آسانی سے
آنکھ ہو، دل ہو، سمندر ہو کہ دریا کوئی
کون بچتا ہے غزالی کہیں طغیانی سے

اُونچے اشجار پر نہیں لگتا
کسی رُت میں ثمر نہیں لگتا
کوئی کتنا بلند ہو جائے
آسماں سے تو سر نہیں لگتا

پریا تابیتا / لاہور

وقت کی طرح یہ سانسیں بھی رواں ہیں اب تک
ایک بس اشک تھے اور رُکا کچھ بھی نہیں

میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ پریا تابیتا خود زیادہ اچھی ہیں یا اُن کی شاعری۔ میں نے جب بھی کسی مشاعرے میں اُن کی شاعری سنی یا کسی ادبی جریدے میں اُن کی کوئی غزل پڑھی تو دیر تک اس کے حصار میں رہا۔ پریا تابیتا کی شاعری جزیرے میں کھلے ہوئے کسی باغ کی طرح ہے جس کی مہک پڑھنے والے کے دل کے ساحل اور آنکھوں کی لہروں سے بھی آتی ہے۔ (حسن عباسی)

فیصلوں کی آڑ میں اب فاصلہ ہونے کو ہے
ابتدا تو ہو گئی تھی انتہا ہونے کو ہے
ہم نے تھا کچھ اور چاہا اور کیا ہونے کو ہے
اک ذرا سا واقعہ اب سانحہ ہونے کو ہے
پھر ہوائیں اجنبی ہیں اور سہمی ہے فضا
پھر کہیں شہرِ گماں میں حادثہ ہونے کو ہے
حاکمِ ارضِ وطن سے کیا توقع کیا گلہ
وہ خود اپنے نفس کا اب آئنہ ہونے کو ہے
بے خبر صوبوں کے وُزرا اور بے حس جانشیں
کیا پتہ کیا ہو گیا ہے اور کیا ہونے کو ہے
کر سکے بس یہ دھماکوں کی مذمت اب تلک
اور سمجھے فرض ان کا یوں ادا ہونے کو ہے
ہیں سراپا بد دیانت یہ خزانوں کے امیں
قوم ان کے دم سے اب دیوالیا ہونے کو ہے
زد میں ہیں اہلِ وطن اور ضد میں حاکم وقت کے
بر سرِ پرخاش اب ہر مرحلہ ہونے کو ہے
سب ہراساں ہو گئے بچے بڑے بوڑھے جواں
امن کا ارماں یہاں اب معجزہ ہونے کو ہے
ہم سے ہو گا وہ مخاطب معجزاتی طور پر
آج حاکم قوم کا حاکم نما ہونے کو ہے
ہر گھڑی وحشت زدہ ہیں قافلے والے سبھی
کون سا رہزن یہاں اب رہنما ہونے کو ہے

ہم ہی ٹھہرے ہیں سزاوارِ خطا کچھ بھی نہیں
تُو سمجھتا ہے ترے بعد ہُوا کچھ بھی نہیں
یاد جب آئی تری یاد رہا کچھ بھی نہیں
دل نے بس آہ بھری اور کہا کچھ بھی نہیں
وقت کی طرح یہ سانسیں بھی رواں ہیں اب تک
ایک بس اشک تھے اور رُکا کچھ بھی نہیں
ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر وہ گیا ہے جب سے
مَیں نے اُس وقت سے ہاتھوں سے چھوا کچھ بھی نہیں
مجھ سے کہہ دے وہ کسی روز اچانک آ کر
میرے جیون میں ترے بعد بچا کچھ بھی نہیں
بعد مدت کے ملا آج وہ پہلے کی طرح
اور اس بار اُسے مَیں نے کہا کچھ بھی نہیں

کتابِ ارضی میں اس صدی کا سیاہ کتنا یہ باب آیا
مرے وطن کا بنا حوالہ جہاں بھی کوئی عذاب آیا
لٹی سیاست، سیاستوں میں، بنی حکومت، عداوتوں میں
صداقتوں کا لبادہ اوڑھے، رذیل آیا، کذاب آیا
ہماری دھرتی پہ بنتِ ارضی، جئے زمیں پر یا قبر میں ہو
اُڑی ہیں عصمت کی دھجیاں یوں درندگی کا عذاب آیا
کہیں پہ شوہر کے ٹکڑے کر کے، ملول بنتِ بشر نہیں ہے
کہیں پہ مُردے پکا کے کھانا، عجب مقامِ خراب آیا
خلوص، مہر و وفا، محبت، چلن وہ امن و مفاہمت کا
جیسی یہ ساری باتیں، کسی کو جیسے ہو خواب آیا
کہیں وبائیں ہیں آفتیں ہیں، کہیں پہ سیلِ بلا رواں ہے
یہاں پہ برپا ہے قہر ہر جا، چمن یہ زیرِ عتاب آیا
کہیں دھماکے، کہیں پہ گولی، کہیں پہ تاوان اور چوری
یہاں بشر ہے شرار جیسا، یہاں یہ مثلِ حباب آیا
خیالِ روزِ جزا نہیں ہے، کہیں بھی خوفِ خدا نہیں ہے
گنہ نے حد سے کیا تجاوز، قریب روزِ حساب آیا
اَے پاک پروردگار، داتا، درازِ دستِ سوال میرا
بنے گی دھرتی یہ تب مثالی کہ جب بھی تیرا جواب آیا

میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے کہ جب ذات مری
کچھ کی حیرت میں رہی کچھ کے سوالوں میں کہیں
میری آنکھوں میں سمٹ آئے تھے سب درد مرے
اُلجھنیں ساری اُلجھ بیٹھی تھیں بالوں میں کہیں
آج معروف ہے وہ شخص مثالوں کی طرح
تُو جسے چھوڑ گیا چند حوالوں میں کہیں
میرے جیون کی سیاہی تیرے جاتے ہی گئی
ڈھونڈنا ہو تو مجھے ڈھونڈ اُجالوں میں کہیں
اب تو یادوں کا تصور بھی مرے پاس نہیں
اب مجھے یاد کرو بھولنے والوں میں کہیں

خورشید ربانی

آوارگانِ شوق کا رستے میں تھا ہجوم
میں نے مگر ہجوم میں رستہ بنا لیا

خورشید ربانی غزل میں اسلوب کی سادگی کے حوالے سے ناصر کاظمی کے قریب ضرور ہیں لیکن جذبے اور خواب ان کے اپنے ہیں۔ اردو ادب کے ناقدین انھیں خوب صورت خوابوں اور زندہ جذبوں کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کی شاعری خوب صورت خوابوں اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کے درمیانی رستے کی مسافت کا تجربہ ہے۔ تلخی سے مٹھاس کشید کرنے کا عمل۔۔۔۔۔ جو کسی حد تک شہد کی مکھیوں کے شہد بنانے کے عمل سے مشابہ ہے۔ اس سفر میں وہ خوشنما خواب اور جذبے چن کر اپنی جھولی میں ڈالتے ہیں اور ان سے زندگی کی بدصورتیوں کو ڈھانپنے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ (پروفیسر یونس خیال)

سائے کو دھوپ، دھوپ کو سایہ بنالیا
اک لمحۂ وصال نے کیا کیا بنا لیا
اک شہرِ ناشناس میں جانے کی دیر تھی
بیگانگی نے مجھ کو تماشا بنا لیا
آوارگانِ شوق کا رستے میں تھا ہجوم
میں نے مگر ہجوم میں رستہ بنا لیا
خوابوں کی میں نے ایک عمارت بنائی اور
یادوں کا اس میں ایک دریچہ بنا لیا
اتنی سی بات ہے کہ اسے مل نہیں سکا
اس نے بڑھا کے بات کو جھگڑا بنا لیا

کوئی گلاب کبھی اس کا دل دکھایا تھا
سو ریگزار پہ بھی وحشتوں کا سایہ تھا
اتر کے شاخ سے اک ایک زرد پتے نے
نئی رتوں کے لیے راستہ بنایا تھا
وہ شاخِ سایۂ اخلاص کٹ گئی اک روز
تپش سے جس نے مجھے عمر بھر بچایا تھا
شجر شجر کو نشانہ بنانے والو، تمھیں
خیال بھی نہ کسی گھونسلے کا آیا تھا
کسی خیال کسی خواب کے لیے خورشید
دیا دریچے میں رکھا تھا دل جلایا تھا

جانے کس مجبوری میں
پھول کھلا ہے کھڑکی میں
اس کے لبوں پر میرا نام
آگ لگی ہے پانی میں
کس سے ملنے جاتا ہے
دریا بیٹھ کے کشتی میں
عکس فلک پر روشن ہے
چاند ہے بہتے پانی میں
خاموشی دیوار سے کچھ
کہتی ہے سرگوشی میں

چراغِ زخمِ تمنا لو بڑھائے ہوئے
فصیلِ دل میں ہے اک آس در بنائے ہوئے
اک آرزو کے سفر سے پلٹ رہا ہوں میں
دل و نگاہ کی محرومیاں اٹھائے ہوئے
کوئی نہیں جو مٹائے مری سیہ بختی
فلک پہ کتنے ستارے ہیں جگمگائے ہوئے
بہت دنوں سے ہے خورشید یہ خرابۂ دل
مرے نصیب کی ویرانیاں بسائے ہوئے

کوئی دل میں سما گیا ہوا تھا
زندگی سے میں آشنا ہوا تھا
اس کا بندِ قبا کھلا ہوا تھا
یا کوئی عکس آئنہ ہوا تھا
بات کرنے کو لفظ تھے ہی نہیں
آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا تھا
کوئی آیا تھا میرے گھر میں اور
سارا آنگن کھلا کھلا ہوا تھا
کس کی خاطر اجاڑ رستے پر
پھول لے کر شجر کھڑا ہوا تھا
چاندنی جھیل میں اترتے دیکھ
پیڑ سکتے میں آ گیا ہوا تھا

ایک شجر آنگنائی میں
جلتا ہے تنہائی میں
جاگ اٹھی اک خواہش اور
مہکے پھول کلائی میں
خواب کنارے ملتے ہیں
دو سائے تنہائی میں
بینائی کا خون بھی ہے
اشکوں کی رعنائی میں
دریا ڈوب گیا خورشید
قطرے کی پنہائی میں

کنارِ شام کیا جلنے لگا ہے
ہر اک بجھتا دیا جلنے لگا ہے
ترا بخشا ہوا اک زخم پیارے
چلی ٹھنڈی ہوا، جلنے لگا ہے
کسی کے عکس میں تھی ایسی حدت
تپش سے آئینہ جلنے لگا ہے
ستارہ سا کوئی آگے رواں ہے

حسرت بلال حسرت/ساہی وال

حسرت بلال نام اور حسرت تخلص کرتے ہیں۔ آپ ۱۲ مئی ۱۹۷۵ء کو پاکپتن شریف میں پیدا ہوئے۔ جب آپ پانچ سال کے تھے تو آپ کے والد گرامی اپنے اہل خانہ کے ہمراہ مستقل طور پر ساہیوال منتقل ہو گئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز آپ نے ساہیوال کے گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر L-90/9 سے کیا۔ میٹرک گورنمنٹ سہائی سکول ساہیوال سے ملتان بورڈ میں دوسری پوزیشن حاصل کر کے سلور میڈل کے حق دار ٹھہرے۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال سے ایف-اے، بی-اے اور ایم-اے معاشیات تک تعلیم حاصل کی۔ آپ شاعری کے مختلف مقابلوں میں متعدد بار نمایاں پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کو عروض کا ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کے بعض شاگرد صاحب دیوان ہیں۔ آپ کا کلام ملک کے معروف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ ساہیوال کی متعدد ادبی تنظیموں کے جنرل سیکرٹری بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل آپ ساہیوال کی معروف ادبی تنظیم مجید امجد اکیڈمی رجسٹرڈ کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں۔ (ارژنگ)

اہل وفا سے رابطہ جس وقت کٹ گیا
میرا وجود بانہوں میں اپنی سمٹ گیا
جانے عجب خیال سے دل دھک سے رہ گیا
دستک دیے بغیر میں در سے پلٹ گیا
جس پر کبھی لکھے تھے محبت کے چار حرف
اُس کی مداخلت سے، شجر وہ بھی کٹ گیا
جگنو تمہاری یاد کے، دل میں اُتر گئے
تاریک شہر دل کا جو منظر تھا چھٹ گیا
میرے فشارِ خون میں ہلچل مچی رہی
حسرت تمہارا ہجر، مقابل جو ڈٹ گیا

دل میں اخلاص و محبت کو تو زندہ رکھو
پیار کی ریت، روایت کو تو زندہ رکھو
وہ کسی خواب جزیرے کا مکیں ہے لیکن
حسرتِ دل، دلِ حسرت کو تو زندہ رکھو
تیری معصوم اداؤں میں سکونِ دل ہے
یہ محبت ہے، محبت کو تو زندہ رکھو
ہاں، وفاداری وارثت میں ملی ہے ہم کو
تم مری جان، وراثت کو تو زندہ رکھو
پیار انسان کی بنیادی ضرورت رہا ہے
اپنی بنیادی ضرورت کو تو زندہ رکھو
تیری آنکھیں ہیں مرے دل کی عمارت کا نور
میری بے نور عمارت کو تو زندہ رکھو

بلبل تمہارے نام گل تر تمہارے نام
ہر ایک زندگانی کا منظر تمہارے نام
کلیاں، گلاب، نرگس و عنبر تمہارے نام
اور خوشبوؤں کے سارے سمندر تمہارے نام
مرجھا گئے جو پھول، وہ سب میری کائنات
حسن و جمال کے سبھی پیکر تمہارے نام
ناکامیاں لکھی ہوئیں میرے نصیب میں
اور کامیابیوں کا ہر اک در تمہارے نام
تنہائیوں کا سنگ ملامت ہے میرے نام
اور چاہتوں کے لعل و جواہر تمہارے نام
لکھ لکھ پیام بھیج رہا ہے جنوں کے ساتھ
حسرت بلال سا، یہ سخنور تمہارے نام

ہو گیا ہجر میں کیا حال، ذرا کرنا خیال
آنے والا ہے نیا سال، ذرا کرنا خیال
عشق میں ایک بھی پل اُونگھ گوارا نہیں ہے
عمر بھر جاگوں ترے نال، ذرا کرنا خیال
تجھ اداؤں مری چاہ تری راہ پہ ہے
مار ڈالے گی تری چال، ذرا کرنا خیال
میں اکیلا ہی ترے حسن کا شیدائی نہیں
شہر کا شہر ہے بے حال، ذرا کرنا خیال
دلِ حسرت ہے ترے عشق سے خوشحال بلال
تو بھی تو حسرتِ دل پال، ذرا کرنا خیال

نہ پوچھ کیسے یہ پل پل شمار ہو رہا ہے
تمہارا شام و سحر انتظار ہو رہا ہے
تمہارے لفظوں میں تو پھول رکھ دیے گئے ہیں
تمہارے بعد بھی جشن بہار ہو رہا ہے
میں اُس کو یاد کروں، گر بھلا دیا گیا ہو
یہ رشتہ ہجر میں تو پائیدار ہو رہا ہے
یہ کیسے شہر میں پہنچا دیا گیا ہے مجھے
کہ تیغ ہجر کا یاں دل پہ وار ہو رہا ہے
عجیب خوف کا احساس دے دیا گیا ہے
اُڑان پر یہ اثر بار بار ہو رہا ہے
کوئی تو چارہ کرو، چارہ ساز و غم خوارو
یہ عشق تو مرے سر پر سوار ہو رہا ہے

یہ کائناتِ دل اس آس پر بنی ہوئی ہے
حضور حسرتِ دل رہ گزر بنی ہوئی ہے
یہ حالِ حالتِ حالات کا فسانہ ہے
خموش رہنا مرا اک خبر بنی ہوئی ہے
تمہارا ہجر جو ہے، میرا گھر بنا ہوا ہے
تمہاری یاد جو ہے ہم سفر بنی ہوئی ہے
مجھے تو لگتا ہے روزِ ازل کی بات ہے یہ
کہ میری زیست تری منتظر بنی ہوئی ہے
یہ سانحہ بھی عجیب و غریب ہے حسرت
کہ عمر بھر سے غمی، راہبر بنی ہوئی ہے

سردار عظیم اللہ خاں/لاہور

نہ جانے کون ہیں وہ جن پہ مہرباں ہے تو — تجھے اے زندگی ہم ہر جگہ پکار چلے

بے مثل و بے مثال ہے ہستی حضورؐ کی
صناعی کا کمال ہے ہستی حضورؐ کی
روزِ جزا میں مجھ سے خطاکار کے لیے
رحمت کی ایک ڈھال ہے ہستی حضورؐ کی
پرتو ہے جس کے نور میں حق کے جمال کا
وہ نورِ لازوال ہے ہستی حضورؐ کی
قدسی بھی ہم زباں ہیں مرے مدح میں اُس کی
کتنا حسیں خیال ہے ہستی حضورؐ کی
تیرہ شبی کے غار میں مہتاب کی طرح
روشن جو ایک لعل ہے ہستی حضورؐ کی

کیسی مہلت ہے زندگی دیکھو
ہر گھڑی درد کی گھڑی دیکھو
نام و ناموس رہن رکھ کر سب
جی رہے ہیں ہنسی خوشی دیکھو
ننگِ اسلاف ہیں تبھی چپ ہیں
ورنہ ایسی تھی یہ گھڑی دیکھو
وحشتیں ناچتی رہیں گھر میں
ہم سے کچھ بھی نہ بن پڑی دیکھو
کیا غضب ہے خدا کے بندے کی
آنکھ اُس بت سے جا لڑی دیکھو
بس اسی پل کے منتظر تھے سب
ایسی ہوتی ہے دوستی دیکھو

چاند کے ساتھ

چاندنی رات تھی بھرپور جواں اُس کی طرح
جس کی آغوش میں لپٹا ہوا چرخِ کہنہ
اک عجب کیف کے عالم میں نظر آتا تھا
لبِ جو بیٹھے ہوئے ہیں میں اور وہ
چاند سے چاندنی سے بے پروا
ایک انجانے اور ان دیکھے جہاں کی دُھن میں
اتنے مدہوش کہ اس بات سے بھی بے خبر ے
ندی کی آنکھ تو ماہتاب کا مسکن ہے کوئی
مرے سائے سے لپٹتے ہوئے اُس نے اک دم
اپنی پلکوں کو مری پلکوں سے چھو کر یہ کہا
کاش یہ رنگ بھری رات کبھی ختم نہ ہو
ندی کی آنکھ میں یہ عکس ذرا تھم جائے
شبِ خلوت کا سماں تھا وہ تھا
اور اس خواب سی خوش رنگ حقیقت کو سدا
باندھ لینے کی آرزو بھی تھی
اُس حسیں پل میں نہ جانے کب تک
شب پرنوا و مہ تاباں
منہ چھپاتے رہے اک دوجے سے
آخرش صبح کو بھی آنا تھا
آ گئی صبح جدائی دھم سے
ہر حقیقت تھی ایک خواب فقط

آنکھ تو پھر آنکھ ہے دل سے بھی اوجھل ہو گیا
گلشن دل جس کے بن ویران جنگل ہو گیا
قید تھا میں تو مری جھوٹی انا کے خول میں
اُس کی آنکھوں سے مگر انجان کاجل ہو گیا
تھی عجب تاثیر میرے چارہ گر کی آنکھ میں
آنکھ بھر کر جس کو بھی دیکھا وہ پاگل ہو گیا
ہجر کے موسم نے یوں ترتیب دے دی زندگی
آنے والی ہر خوشی بیتا ہوا کل ہو گیا
میں نے جب اُس سے کہا تیرے بنا مشکل میں ہوں
ہنس کے یوں گویا ہوا اب چھوڑ بھی چل ہو گیا

طرحی غزل

زمیں سے تا بہ افق نور بے شمار چلے
زمانہ وجد کی حالت میں جاں نثار چلے
طیور رقص میں ہوں جھومتی بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
یہ بات میری سمجھ سے ہے آج تک باہر
وہ مجھ کو جیت کے پھر کیسے مجھ کو ہار چلے
عجیب زعم تھا کہ وہ پلٹ کے آئے گا
سو ایک عمر اسی وہم میں گزار چلے
نہ جانے کون ہیں وہ جن پہ مہرباں ہے تو
تجھے اے زندگی ہم ہر جگہ پکار چلے
خزاں کی شام بھی شامِ بہار لگتی ہے
کبھی جو شانوں پہ بکھرائے زلف یار چلے

وسیم عباس/لاہور

اشکِ ہجراں کی ذرا قیمت و حرمت سمجھو
یہ وہ گوہر ہے جو تجدید وفا کرتا ہے

اپنے اشعار میں کچھ درد جگا لینے دے
خواب کے شہر سے بس لوٹ کے آ لینے دے
سانس کی ڈور پہ تُو عشق کی تصویر نہ بُن
مجھ کو دھاگہ کوئی مضبوط بنا لینے دے
اے مری جان کے دشمن، تُو ذرا دیر سے آ
مجھے رستوں کو محبت سے سجا لینے دے
اُن کی دہلیز پہ بیٹھے ہوئے اب شام ہوئی
اُن کو اک بار تو دہلیز پہ آ لینے دے
میری آنکھوں میں بھی سیلاب اتر آئے گا
اُن کے ہونٹوں پہ مرا نام تو آ لینے دے
ضبط لازم ہے مگر ایسے تو مر جاؤں گا میں
اے مرے درد مجھے اشک بہا لینے دے
زندگی! کتنے زمانوں سے کھڑا ہوں در پہ
موت سے قبل اسے مل کے تو آ لینے دے

میں اپنی چاہتیں سب کھو رہا ہوں
گریزاں ہر کسی سے ہو رہا ہوں
میں جتنا گم ہوں اپنی جستجو میں
میں اُتنا اور تنہا ہو رہا ہوں
ہواؤں میں کبھی جو جل رہا تھا
اُسی کچے دیئے کی لو رہا ہوں
مسلسل عشق ہے جو بڑھ رہا ہے
وفا کے بیج اب تک بو رہا ہوں
میں ہنسنا چاہتا ہوں کھلکھلا کر
دُکھوں کے بار اب تک ڈھو رہا ہوں

فراقِ یار نے مارا ہے مجھ کو
سمجھتے لوگ ہیں میں سو رہا ہوں
وسیم اس نے جہاں چھوڑا تھا مجھ کو
وہیں پہ آج بیٹھا رو رہا ہوں

دل کی دُنیا میں عجب شور مچا کرتا ہے
کوئی مجھ میں تیرے ملنے کی دُعا کرتا ہے
میں نہ مانوں گا کوئی بات بھی ظالم دل کی
یہ بھی کب میری کوئی بات سنا کرتا ہے
اشکِ ہجراں کی ذرا قیمت و حرمت سمجھو
یہ وہ گوہر ہے جو تجدید وفا کرتا ہے
تو نے جانا ہی نہیں میری وفاؤں کو کبھی
دل مرا بس تیری چاہت میں جیا کرتا ہے
پا بہ زنجیر مرا عشق ہے لیکن دیکھو
یہ قفس میں بھی بڑا حشر بپا کرتا ہے
ہجر کی آہنی دیواروں کے آگے اے وسیم
تو دیا بن کے ہواؤں سے لڑا کرتا ہے

سفر میں یوں تو مرے سایہء شجر بھی ہے
نہ جانے کیسا مگر دل میں ایک ڈر بھی ہے
مٹی مٹی سی لکیریں ہیں میرے ہاتھوں کی
مرا نصیب نہیں تو ، مجھے خبر بھی ہے
ذرا حصار سے باہر نکل کے دیکھو تو
تمہاری چاہ میں برباد اک نظر بھی ہے
قلندری ہی مجھے راس آ گئی ورنہ
مری زمین بھی ہے اور میرا گھر بھی ہے

یہ میرے حلقہء یاراں نے کر لیا محسوس
کہ شاعری میں مری ہجر کا اثر بھی ہے
ہے کچھ تو چھائی ہوئی بھی فضا اُداسی کی
کچھ اس میں یاد کا تیری مگر اثر بھی ہے
نہ جانے کیا ہوا تاثیر کھو گئی ہے وسیم
سخنوری کا وگرنہ بڑا ہنر بھی ہے

بیچ گرداب کے دریا کے کنارے کیسے
ڈوبنے والوں کو تنکوں کے سہارے کیسے
اک یہی بات مری سوچ کے دھارے میں رہی
چھوڑ جاتے ہیں برے وقت میں پیارے کیسے
ہر طرف گرد ہے آنکھوں پہ دھواں طاری ہے
دل مرا بھول سکے گا یہ نظارے کیسے
بوجھ لمحوں کا اکیلے بھی تو اٹھ سکتا ہے
کوئی سانسوں کی اذیت کو گزارے کیسے
جب صدا صحبتِ زنجیر میں مر جاتی ہو
ایسی حالت میں تجھے کوئی پکارے کیسے
خود ہی حالات بدلنے کے لئے نکلا ہوں
کوئی آ کر مری تقدیر سنوارے کیسے
دشتِ عشق ہی مہلت نہیں دیتی ہے وسیم
قرضِ افلاس کے دیوانہ اتارے کیسے

دل کی دُنیا میں عجب شور مچا کرتا ہے
کوئی مجھ میں تیرے ملنے کی دُعا کرتا ہے

ارمان یوسف/برطانیہ

یہ جبینوں پہ وفاؤں کے نشاں کیسے ہیں
کوئی اخلاص نہیں ہے تو عبادت کیسی

ارمان یوسف جدید تسلسل کا ایک روشن باب ہے۔ اگرچہ وہ ابھی نوجوان ہی ہے مگر اس نے کم وقت میں بہت کام کیا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا، محفلیں سجاتا گیا۔ باہمت، پر خلوص اور اپنے کام سے عشق کرنے والا وہ نوجوان زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب و کامران رہا۔ وہ ہمارے درمیان کو کم عرصہ رہ کر بیرونِ ملک چلا گیا۔ مگر وہ دور جا کر بھی دوستوں کے اور بھی قریب ہو گیا۔ اس نے برطانیہ میں بھی حسبِ سابق ادبی حلقوں میں نہ صرف اپنا آپ منوایا بلکہ وہ آج وہاں بھی فروغِ ادب کے لیے کوشاں ہے۔ ایک انجمن ترتیب دے کے لندن ایسے معروف شہر میں بھی دوست اکٹھے کر کے ادبی محافل منعقد کراتا رہتا ہے۔ ارمان کا پورا نام حافظ محمد یوسف اور قلمی نام ارمان یوسف ہی ہے۔ وہ تحصیل علی پور کے ایک نواحی قصبے میں پیدا ہوا اور حفظِ قرآن کے بعد سکول کی تعلیم کا آغاز کیا۔ وہ ہر سال ہر جماعت میں ہمیشہ اول ہی رہا۔ اس نے سرگودھا یونیورسٹی اُردو ادب میں ایم اے کیا۔ جبکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ جبکہ آج وہ لندن میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مصروفِ عمل ہے۔ ارمان یوسف کا ایک شعری مجموعہ "اُسے بھلا دو" 2006ء میں چھپ کر ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ جبکہ اس کی متعدد تصانیف بشمول نثر زیرِ طباعت اور زیرِ ترتیب ہیں۔

آگ دل میں لگا گیا کوئی
مجھ کو اپنا بنا گیا کوئی
ایسا بچھڑا گلاب موسم میں
ہنستے ہنستے رلا گیا کوئی
میں تو اکثر اُداس رہتا ہوں
جب سے نظریں چرا گیا کوئی
راز کھلنے لگے خداؤں کے
مجھ کو پتھر بنا گیا کوئی
زندگی کے اصول بھی یوسف
جاتے جاتے بتا گیا کوئی

مری صدا سفر میں ہے
ابھی دعا سفر میں ہے
جگا رہی ہے دیس کو
مری نوا سفر میں ہے
بڑے کٹھن ہیں راستے
مگر انا سفر میں ہے
ہے میرے دل کی پیاس یہ
کہ کربلا سفر میں ہے
ہر ایک رُخ پہ آج بھی
تری ادا سفر میں ہے

بس ایک بار دیکھ لے
ابھی قضا سفر میں ہے
ابھی تو شہرِ عشق میں
مری وفا سفر میں ہے

محبت میں درد و الم ہو رہے ہیں
ہمارے لیے وہ صنم ہو رہے ہیں
وفاؤں کے بدلے جفا کرتے رہنا
یہاں پر انوکھے ستم ہو رہے ہیں
محبت کے رشتے، تقدس کے رشتے
ہمارے دلوں سے عدم ہو رہے ہیں
نا جانے یہ کیسا ہے ظلمت کا منظر
کہ معصوم چہرے قلم ہو رہے ہیں
کسی بے وفا کی یہ چشمِ عنایت!
اچانک یہ کیسے کرم ہو رہے ہیں
ترے لوٹ آنے سے ارمان یوسف
خسارے محبت کے کم ہو رہے ہیں

تم ہم کو کبھی رسماً اک بار صدا دیتے
اک رات تو کیا جاناں! جیون ہی بتا دیتے
اُس شام کے لمحوں میں، جانے کی نہ ضد کرتے
اُس شام کے منظر کو بے مثل بنا دیتے

بے سمت مسافر کو منزل کا پتا کوئی
تم چھوڑ کے جانے سے پہلے ہی بتا دیتے
اب تم سے جدا ہو کر، اک بات رُلاتی ہے
جو راز کھلا سب پر، وہ پہلے بتا دیتے
گر اُن کو ضرورت تھی، ارمان چراغوں کی
وہ کہتے اگر ہم سے، ہم شام سجا دیتے

میری آنکھوں سے بکھرتی ہے صداقت کیسی
دھڑکنوں میں ہے سرِ شام تلاوت کیسی
پھر کوئی حرفِ وفا ہو کہ گلہ ہو کیسا
جب محبت ہی نہیں ہے تو شکایت کیسی!
یہ جبینوں پہ وفاؤں کے نشاں کیسے ہیں؟
کوئی اخلاص نہیں ہے تو عبادت کیسی!
تیرے بندوں سے بہت پیار کیا ہے میں نے
مجھ کو آفاق نے دی ہے یہ سعادت کیسی!
روشنی بانٹتا پھرتا ہوں زمانے بھر میں
مجھ سے ہوتی ہے یہ ہر روز سخاوت کیسی!
بول اُٹھا ہے سرِ حشر یہی میرے خلاف!
یہ مرے جسم نے کر دی ہے بغاوت کیسی!
قتل پھر ہم نے کیا اپنی انا کا یوسف
آج پھر ہو گئی خود سے یہ عداوت کیسی

(انٹرویو امجد اسلام امجد بقیہ انرٹائٹل سے)

نظم کے اندر مجھے یہ آسانی لگی کہ جو میرے اندر کا آرٹسٹ ہے اس کے لیے زیادہ گنجائش ہے۔ جب میری پہلی کتاب چھپنے کے قریب آئی تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ یہ میرا بہت بولڈ فیصلہ تھا۔ بلکہ اس وقت کے بعض دوستوں کے نزدیک تو بہت احمقانہ فیصلہ تھا۔ اس زمانے میں غزل بہت ''اِن'' تھی اور نظم میں راشد صاحب اور میرا جی اور فیض صاحب کا دور اپنے ''فیگ اینڈ'' پر تھا اور نئی نظم میں کوئی نیا نام اس وقت تک تھا ہی نہیں۔ اصغر گونڈوی کا ایک شعر ہے جو میں اکثر کوٹ کرتا ہوں۔ ؎ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے۔

تو میں نے ایک مشکل راستہ لیا اور پہلی کتاب میں کوئی غزل نہیں رکھی لیکن باقی سب کتابوں میں غزل بھی ساتھ ساتھ کہی۔

ارژنگ: ڈرامے کے حوالے سے سوال کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ڈرامے ''وارث'' کو پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں بن رہے؟ کیا آج کل کے ڈراموں میں وہ تخلیقی جوہر ہی نہیں ہے یا کہ کوئی اور وجہ ہے کہ عوام میں ویسی مقبولیت ان ڈراموں کی نہیں رہی ہے؟

امجد اسلام امجد: اصل میں یہ بڑی اُلجھی ہوئی سی بات ہے۔ اس کا کوئی ایک جواب نہیں ہے اور جن عوامل کا آپ نے ذکر کیا وہ سب کسی نہ کسی حد تک ذمہ دار ہیں۔ 1964ء میں جب ٹی وی آیا تو ہمارے پاس پرفارمنگ آرٹ میں فلم تھی۔ تھیٹر تھا اور ریڈیو تھا۔ یہ تین شعبے تھے اور تینوں میں بوجوہ جو تخلیقی لوگ تھے یا بڑی اچھی اور نئی سوچ والے ان کے لیے ان میں گنجائش نہیں تھی یا کم گنجائش تھی۔ T.V میں آیا تو ان میں تینوں جمع ہو گئے اور تینوں بیک وقت اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتے جس کے سبب ٹی وی ڈرامہ بہت جلد مقبول ہونا شروع ہو گیا۔ پھر یہ کہ ایک ہی چینل ہوتا تھا، اس کی ذمہ داری تھی کہ چونکہ وہ نیشنل چینل تھا اس لیے ملک کے تمام شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی نمائندگی کرے۔ امیر، غریب، کسان، شہری، دیہاتی ہوا یہ کہ ہمارے ڈراموں میں گلدستہ سا بننا شروع ہو گیا جس میں ہماری پوری قومی زندگی کی جھلک نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں مڈل کلاس کا غلبہ رہا۔ آؤٹ ڈور کے لیے وسائل نہیں تھے اور Set designing کی اتنی امپورٹینٹ نہیں ہوتی تھی۔ تو زیادہ تر ڈرامے گھروں میں ڈرائنگ روموں میں، جیسا کہ حسینہ معین نے بہت اچھا ڈرامہ اس زمانہ میں لکھا مگر وہ سارے کے سارے شہری مڈل کلاس کے گرد گھومتے تھے۔ مگر باہر اور خاص طور پر دیہاتی زندگی کی طرف تو بالکل بھی نہیں جاتا تھا۔ منو بھائی کے ''جھول سیال'' اور اکا دکا دوسرے ڈراموں کو چھوڑ کر ''وارث'' سے پہلے آپ کو بہت کم گاؤں کی زندگی Project ہوتی نظر آئے گی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ساٹھ ستر فیصد خاموش اکثریت جسے پچھلے دس بارہ سال میں ٹیلی وژن پر ڈرامے کی مقبولیت کے باوجود جگہ نہیں ملی تو ایک تو وہ اس میں انوالو ہوئی۔ دوسرا یہ کہ ان کے مسائل جو باقی تیس چالیس فیصد ہیں ان لوگوں کے لیے بھی ایک نیا انکشاف تھے کہ اچھا ہمارے ہی ملک میں لوگ اس طرح سے بھی رہتے ہیں اور یہ جو وڈیرے جو کہ شہروں میں پارٹیوں میں یا کہیں ڈسٹ نظر آتے ہیں کیا وہ اتنے ظالم بھی ہو سکتے ہیں؟ پھر اس میں ایکٹنگ بہت اعلیٰ ہوئی۔ اس سے قطع نظر کہ یوں کہتے ہیں کہ وہ لکھا ہی بہت اچھا تھا یقیناً میں نے لکھا بھی اچھا ہوگا۔ ٹی وی کی تاریخ رہی تھی کہ ہر ڈرامے میں دو تین کردار ہی بہت ہوتے ہیں۔ یہ واحد ڈرامہ تھا جس میں چھ سات کردار بہت ہٹ ہوئے تھے۔ یعنی لوگ چوہدری حشمت کو تو دیکھنا چاہتے ہی تھے مگر وہ پا نیاز، چوہدری انوار، دلاور، مولا داد، عظمیٰ گیلانی، طاہر نقوی اور ثمینہ احمد کو بھی دیکھنا چاہتے۔ پھر جیسا میں نے کہا اس زمانے میں معاشرے کے ہر طبقے کو نمائندگی کرتی تھی۔ پی ٹی وی کا دور جب ختم ہوا اور پرائیویٹ چینل آئے تو ان چینلز کی آمد سے یہ فیصلہ کرنا کہ کون سی چیز ٹی وی پر چلنی چاہیے یہ فیصلہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ غلط لوگ اس سسپنس میں یہ یہ ایڈورٹائزر کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اب ایڈورٹائزر جو ہے وہ اپنے کام کو تو یقیناً اچھی طرح جانتا ہے مگر اس کام کو وہ کیسے جان سکتا ہے کہ ڈرامے کا مرکزی خیال کیا ہونا چاہیے۔ فنکاروں کے کردار کیا ہونے چاہئیں۔ ہوا یہ کہ ایڈورٹائزر نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے فلاں اداکار چاہئیں۔ اب اس سے پہلے ٹی وی کریکٹر کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا۔ اب ایکٹر کے حوالے سے دیکھا جانے لگا۔ پھر یہ ہونے لگا کہ مجھے اس معاشی طبقے کی کہانی چاہیے پھر یہ کہ عورتوں پر جو ظلم ہے یہ اگر دکھائیں تو گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتیں متاثر ہوتی ہیں اور اس سے ریٹنگ بڑھتی ہے۔ اب مڑتے مڑتے وہ ڈرامہ جو پورے معاشرے کو دکھایا کرتا تھا اب صرف مخصوص طبقے کو دکھانے لگا اور پھر سارا ہی ڈرامہ ان کے گرد گھومنے لگا۔ تو اس سے آہستہ آہستہ جو ڈرامے کی یونیورسل اپیل تھی وہ متاثر ہوتی ہے لیکن یہ کہنا تھوڑی زیادتی ہوگی کہ یہ جتنا ڈرامہ پچھلے پندرہ بیس سال میں بنا یہ سارے کا سارا بڑا فضول اور بے معنی تھا ایسا نہیں ہے۔ کئی نئے پروڈکشن ہاؤسز اور اچھے مصنف و اداکار آئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جو پی ٹی وی کی روایت تھی اور کولیکٹر نئے ٹرینڈز کا ایک بلنڈ بناتے تو وہ یقین لوگوں کے دل و دماغ میں اپنا گھر ضرور بناتے۔ پرابلم یہ ہے کہ ڈرامے بنتے ہیں چلتے ہیں اور لوگ دیکھتے بھی ہیں مگر ایک ہفتے کے بعد کسی کو نہ اس کی کہانی یاد رہتی ہے نہ کردار۔ سوسائٹی کے سبھی شعبوں کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ اب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا ڈرامہ ہے جسے سب لوگ دیکھنے پر مجبور ہیں۔

ارژنگ: ہمارے معاشرے کا تو بڑا حصہ اور اس کے مسائل تو ٹی وی پر نظر ہی نہیں آتے۔ کیا لوگوں کی غالب اکثریت ٹی وی ڈرامے کے لیے غیر متعلق نہیں ہے؟

میں سمجھتا ہوں آپ کے سوال کا بنیادی جواب یہی ہے۔

ارژنگ: آپ کے گیت بھی بہت مقبول ہوئے۔ آپ کے گیت پاکستان کے زندہ گیتوں میں سے ہیں۔ گیت نگاری کا تجربہ کیسا رہا؟

امجد اسلام امجد: اصل میں گیت نگاری ہماری شاعری کا

حصہ تو شروع سے رہی ہے لیکن پاکستان بننے سے قبل گیتوں پر پابندی الفاظ کا غلبہ رہا۔ بنیادی طور پر تو یہ گیت کی صنف بھی ہندی سے آئی ہے اس لیے یہ غلبہ بھی درست تھا لیکن پھر آرزو لکھنوی کے زمانے سے لے کر ساحر لدھیانوی آئے اور قتیل شفائی، تنویر نقوی تو ان لوگوں نے آ کر ایک ایسی فرہنگ رائج کی جو اردو سے زیادہ قریب تھی۔ میں نے دراصل گیت ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے لکھنے شروع کیے تھے۔ شروع شروع میں جب ہم شاعر بننے کی کوشش کر رہے تھے تو سب سے آسان رستہ یہی تھا کہ آپ کا کوئی گیت ہٹ ہو جائے۔ پھر میں نے ٹی وی پر بچوں کے لیے بہت گیت لکھے۔ ''ہم کلیاں ہم تارے ہیں'' خلیل احمد کے ساتھ میں نے بہت گیت لکھے۔ اب میری تین گیتوں کی کتابیں ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک میں سپنے کا لفظ ''آنکھوں میں تیرے سپنے'' ''سپنے بات نہیں کرتے'' ''سپنے کیسے بات کریں'' اور پھر ان کا جو کلیات چھپا ہے وہ بھی ''سپنوں سے بھری باتیں'' گیتوں میں خوشابی تو ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ تمام موضوعات پر گیت لکھے ہیں۔ غنائیت چونکہ گیت کا بنیادی حصہ ہے اس لیے مجھے گیت خود سے قریب تر بھی لگے۔ اس لیے میں اب بھی گیت لکھتا رہتا ہوں۔ فلموں کے لیے بھی لکھا لیکن بہت کم۔ کچھ ہندوستانی فلموں کے گیت بھی لکھے ہیں لیکن زیادہ تر پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو۔

ارژنگ: کتاب کے زوال کے متعلق سوال ہے کہ ہمارے ہاں کتابیں کم تعداد میں شائع ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ بکتی ہیں۔ مغرب میں لاکھوں کی تعداد میں کتاب شائع ہوتی ہے اور ہمارے ہاں ہزار یا پانچ سو کی تعداد میں ایڈیشن چھپتا ہے۔ اس میں بھی جو مقبول مصنفین ہیں کیا اس کی وجہ ادب سے معاشرے کی دوری ہے یا پھر آن لائن مفت ڈاؤن لوڈ یا پھر ایس ایم ایس وغیرہ کی وجہ سے لوگ مفت چیزیں پڑھ لیتے اور کتابیں خریدتے ہیں۔ آپ کس نظر سے اس صورت حال کو دیکھتے ہیں؟

امجد اسلام امجد: ان ساری چیزوں نے مل کر ہی یہ صورت حال پیدا کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہندوستان کی آبادی چالیس اور کروڑ تھی۔ تقسیم سے پہلے بھی اُردو شاعری کی کتاب کا ایڈیشن ایک ہزار کتاب کا ہی چھپتا تھا۔ یہ جو ہمارے بڑے بڑے استاد شعرا کرام ہیں ان کی کتابیں بھی بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک زبان اتنے زیادہ لوگ جانتے ہوں اور پھر بھی یہ صورت حال ہو، حالانکہ اس وقت تو ادب سے دلچسپی بھی تھی۔ آہستہ آہستہ ہمارے نظام تعلیم کی وجہ سے بچوں کے اندر پڑھنے کی عادت ختم ہوتی چلی گئی۔ فنون جو ہیں وہ علوم پر حاوی ہونا شروع ہو گئے۔ پھر انگلش میڈیم نے آ کر رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جن لوگوں میں کتاب خریدنے کی استطاعت تھی وہ سارے کے سارے ادھر چلے گئے۔ اس پر مستزاد یہ ٹیکنالوجی جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا۔ لائبریری کلچر ختم ہونے لگا۔ بچے کو اردو پڑھنے کی عادت ہی نہیں ڈالی جاتی اور جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اس میں یہ عادت Develop نہیں ہوتی۔ باقی رہی شعرو شاعری کی بات تو شعرو شاعری پہلے بھی کم ہی لوگ پڑھتے تھے۔ زیادہ تر یہ سننے کی چیز ہے۔ اب اگر آپ اپنی پسندیدہ چیز پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے کتاب خریدنا ضروری نہیں رہا۔ آپ کے پاس دس اور طریقے ہیں جس سے آپ وہ چیز پڑھ سکتے ہیں۔ اس میں سنگ دلی ہماری حکومتوں کی بھی ہے کہ سب سے زیادہ ٹیکس کاغذ اور پرنٹنگ کے میٹریل پر ہیں۔ کتاب ہم نے مہنگی کر دی اور پڑھنے کی عادت ختم کر دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی اگر ہم سکولوں کی سطح پر بزم ادب کے پیریڈ، لائبریری کے پیریڈ وغیرہ بحال کیے جائیں تو بچوں کی اس سے ایک بنیاد بن جائے گی۔ پھر وہ ادب کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کتاب سے منسلک رہیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر مجھے اس سے بھی تاریک تر مستقبل نظر آتا ہے۔ اُردو شاعری ادب اور اس کی کتابوں کا۔

ارژنگ: اپنی نئی آنے والی کتابوں کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں۔

امجد اسلام امجد: اصل میں جیسا آپ کے علم میں ہے زیادہ تر میری کتابیں شاعری اور ڈرامے کی ہیں۔ اب ماشاء اللہ کالموں کی بھی آٹھ نو کتابیں ہو گئی ہیں اور سفرنامے بھی چار شائع ہو چکے ہیں۔ تراجم کی تین کتابیں ہیں۔

میرے تحریتی کالم ''کوئی دن اور'' حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور شاعری کی کتاب ''شام سرائے'' ابھی پچھلے برس شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح ڈراموں کا مجموعہ ''خواب جاگتے ہیں'' وہ بھی ابھی دنوں شائع ہوا ہے۔ بہت سی کتابیں پائپ لائن میں ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ آئندہ ایک دو برس میں کوئی چار پانچ کتابیں اور آئیں گی۔

ارژنگ: نیا ڈرامہ بھی کوئی لکھ رہے ہیں؟

امجد اسلام امجد: ہمیں فیڈ بیک اس حوالے سے بھی لینی چاہیے کہ کون سی چیز کتنے لوگوں تک پہنچی ہے۔ پھر ان کی اوسط فیڈ بیک سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ ایسی چیز ہے جو لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ دیکھتے ہیں۔ شاعری ایک مختلف چیز ہے، میرا نہیں خیال کہ کوئی چار پانچ لاکھ سے زیادہ لوگ ملا جلا کر پڑھتے ہیں۔ شاعری کی فیڈ بیک ہمیں کئی چار پانچ لاکھ لوگوں سے لینی چاہیے۔ اگر ہم جنرل کریں گے تو......!

تو پھر معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ ڈرامہ میں نے پچھلے آٹھ دس سال سے لکھا ہی نہیں سوائے ایک ایئرفورس کے متعلق۔ ''شیر دل'' کے ڈرامہ لکھنا تو میں نے بند ہی کیا ہوا ہے۔ اب پھر میں شاید لکھوں گا۔ کیونکہ اب یہ احساس پیدا ہوا کہ ایک دائرے کے ڈراموں سے انہوں نے بہت سارے ناظرین کھو دیے ہیں اور اب لوگ اس طرح کے ڈرامے نہیں دیکھنا چاہتے اور بیزار ہیں۔ اب کچھ لوگ واپ آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارا اسی اور نوے کی دہائی کا کلاسیکی ڈرامہ۔

صرف میں ہی نہیں منو بھائی نہیں لکھ رہا۔ حسینہ معین اور بانو قدسیہ نہیں لکھ رہیں۔ یونس جاوید نہیں لکھ رہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تھوڑی سی جگہ بنی ہے اور میں بھی ایک ڈرامہ سیریل لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔

ادبی خبریں/تقریبات

فرتاش سیّد کے اعزاز میں محفل مشاعرہ

اعتراف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام دوحہ (قطر) سے آئے ہوئے معروف شاعر فرتاش سیّد کے اعزاز میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر نجیب احمد نے کی۔ مہمان خصوصی فرتاش سید اور مہمان اعزاز ملک وال سے تشریف لائے ہوئے شاعر انیس احمد تھے۔ تقریب کی نظامت معروف شاعر، سفرنامہ نگار اور اعتراف انٹرنیشنل کے چیئرمین حسن عباسی نے کی۔ تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ نعت کی سعادت معروف نعت گو شاعر عبدالمجید چٹھہ کے حصے میں آئی۔ جن شعرائے کرام نے اس مشاعرے میں اپنا کلام سنایا اُن میں قائم نقوی، شفیق سلیمی، اسلام عظمی، ڈاکٹر کوثر محمود، ابرار حامد، علی رضا، زاہد ہما، کامران نذیر، منصور فائز، عقیل اختر، اظہر حسین، فراست رضوی، سہیل یار، افتخار اشعر اور اقبال پیام کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ تقریب کے آخر میں فرتاش سید اور انیس احمد سے اُن کا بہت سا کلام سنا گیا جسے سامعین نے بہت سراہا۔ صاحب صدر نجیب احمد نے مہمانوں کی شخصیت اور کلام سے متعلق اظہار خیال کیا اور مشاعرے کی تقریب کو یادگار تقریب قرار دیا۔ آخر میں انھوں نے اپنا پنجابی اور اُردو کلام سنا کر تقریب کو چار چاند لگا دیے۔

روداد مشاعرہ

حال ہی میں ''ارتقاء انٹرنیشنل کلچرل فورم'' کے نام سے اٹلی میں ایک ادبی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کے اغراض و مقاصد اور عہدیداران کا بعد میں اعلان کیا جائے گا۔ اس ادبی تنظیم کی ذیلی شاخ کی داغ بیل پاکستان میں بھی ڈالی گئی۔ 2 شوال یعنی عید کے دوسرے دن بھلوال میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت مشہور شاعر جناب سائل رضا نے کی جس میں بھلوال و سرگودھا سے معروف شعراء نے شرکت کی۔ جن میں قندیل جعفری، قاسم خیال، زین بادشاہ، رؤف ایاز، عرفان اداس، احسان الٰہی ساگر، رانا فیاض، علی اقدس اور عاطف وحید یاسرؔ شامل تھے۔ مشاعرہ میں معروف شاعرہ شازیہ نورین صاحب نے اٹلی سے ٹیلیفونک شرکت کی اور اپنا کلام پڑھا۔ اختتام پر ارتقاء انٹرنیشنل کلچرل فورم (پاکستان) کے قیام کا باقاعدہ اعلان بھی کیا گیا۔

مشاعرے کی نظامت تفضیلؔ شیرازی نے کی اور اپنا کلام سنایا۔

آگ لگتی یاد ہے پھر سب سماں غائب ہوا
دیکھتے ہی دیکھتے اپنا مکاں غائب ہوا
آسماں میں تھا تو پھر مجھ کو زمیں کی فکر تھی
اب زمیں پہ پاؤں پڑتے آسماں غائب ہوا
اس قدر پیوست یادِ یار سے میں ہو گیا
یہ یہاں غائب ہوئی اور میں یہاں غائب ہوا

اس کے بعد علی اقدس نے اپنا کلام پیش کیا۔

وقت بے وقت جو تاکید کو لے آتے ہیں
لوگ الفت میں بھی تنقید کو لے آتے ہیں
ہر مسافت میں فقط ساتھ ترا ہی لے کر
ہم شراکت میں بھی توحید کو لے آتے ہیں
تم تو رکھتے ہو مقلد بھی ہزاروں اندھے
بات سنتے نہیں تائید کو لے آتے ہیں

اس کے بعد رؤف ایازؔ نے اپنا کلام پیش کیا۔

شور کرتے ہوئے چوں کا سنائی دینا
کس کو آتا ہے یوں چپ چاپ رہائی دینا
ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وقت کے ہمراہی ہیں
عکس بہتے ہوئے پانی میں دکھائی دینا
گھر سے نکلا تو مری ماں نے نصیحت کی تھی
میرے ہاتھوں میں پسینے کی کمائی دینا

رؤف ایاز کے بعد عاطف وحید یاسرؔ نے شرکاء کو کلام سنایا۔

اب بھی تیری یاد سنبھالی جاسکتی ہے
یہ خواہش تو دل میں پالی جاسکتی ہے
آنکھ میں پہلا اشک اُسی کے نام پہ آیا
ساری بات اسی پہ ڈالی جاسکتی ہے
تجھ سے نہیں پر خود سے بھاگ ہی سکتا ہوں میں
سر سے ایک بلا تو ٹالی جا سکتی ہے

جن کے بعد متعدد شعراء نے اپنا کلام پیش کیا اور پھر معروف شاعرہ شازیہ نورین نے اٹلی سے ٹیلیفونک رابطے کے ذریعے اپنا کلام پیش کیا۔

سکوت سے یہ چلی اور بیاں تلک پہنچی
کہاں سے بات یہ چل کے کہاں تلک پہنچی
وصال سے غمِ ہجراں تلک گئے ہم لوگ
یقین سے یہ کہانی گماں تلک پہنچی
اُٹھیں گے اس سے کئی زلزلے مرے ہمدم
میری صدا جو کبھی آسماں تلک پہنچی

مشاعرے کے اختتام پر صدرِ مشاعرہ جناب سائل رضا نے بزم کے قیام کے اعلان کے ساتھ اپنا کلام پیش کیا۔

کیوں یہ میّت پہ عجب شور سا ہنگام کا ہے
کیا خبر کون سا لمحہ مرے آرام کا ہے
تم جسے پیار کا آغاز سمجھ بیٹھی ہو
میں سمجھتا ہوں یہ لمحہ کسی انجام کا ہے
میری تربت پہ گئے وقت کا رونا کیسا
اب یہ ہمدردی یہ مرے کس کام کا ہے

مشاعرے کے اختتام پر شرکاء کو ظہرانہ پیش کیا۔

حلقۂ ادب کے زیرِ اہتمام عید ملن مشاعرہ

پچھلے دنوں حلقہ ادب اوکاڑہ کے زیرِ اہتمام گنج شکر سپیشل ایجوکیشن کمپلیکس اوکاڑا میں عید ملن مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت خالد نذیر سیال ڈائریکٹر لوکل گورنمنٹ نے کی۔ جبکہ مہمانِ خصوصی علی وارث انصاری، ڈائریکٹر ایف ایم ریڈیو آواز (105.4) تھے۔ مہمانانِ اعزاز میں پروفیسر احمد ساقی، ڈاکٹر شمیم الحق اور قمر حجازی کے نام شامل تھے۔ جن شعرائے کرام نے اس محفلِ سخن میں اپنے افکار کی خوشبو بکھیری اُن میں علی وارث انصاری، احمد ساقی، مسعود احمد، احمد جلیل، قمر حجازی، کاشف مجید، سخنور نجمی، ارشد علی ارشد، امین انجم، فضل احمد خسرو، جاوید عارف، حیدر علی ساحر، سہیل امجد، محبوب عالم طارق، محمد جہانزیب اور نواز الغنی کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر ندیم اصغر نے نظامت کے فرائض بطریق احسن نبھائے۔ اس محفل سخن کا آغاز محمد جہانزیب نے تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا۔ مدحتِ رسولؐ کی سعادت امین انجم کے حصے میں آئی۔ بعد ازاں محفل شعر سجی۔ معیاری اشعار سن کر کثیر تعداد میں موجود باذوق سامعین نے خوب داد دی۔ اس محفل سخن سے انتخاب نذرِ قارئین ہے:

شروع ہونے سے پہلے سوچ لو تم
تمہیں کب تک تماشا دیکھنا ہے
(علی وارث انصاری)

دیکھ کر وہ مجھے پتھر کی طرح ہو جاتا
میں نے اس کو کبھی تصویر نہیں ہونے دیا
(احمد ساقی)

پیڑوں کی طرح ہیں نہ پرندوں کی طرح ہیں
زندہ بھی ہیں تو کون سا زندوں کی طرح ہیں
(مسعود احمد)

اپنا تو محبت میں بس یہی عقیدہ ہے
جس سے پیار کرنا ہے بے حساب کرنا ہے
(احمد جلیل)

خلق ایمان بھی لے آئے گی
میں خدا ہونے سے کتراتا ہوں
(کاشف مجید)

ہر ایک دکھ مجھے اپنا دکھائی دیتا ہے
کسی کے دکھ پہ کبھی بھی ہنسی نہیں آئی
(فضل احمد خسرو)

ساری رات گزاری گلاں باتاں وچ
ارشد فیر او گل ادھوری رہ گئی اے
(ارشد علی ارشد)

مری دستار بندی کا کوئی معیار لے کے آ
مرے کردار کے تو سامنے کردار لے کے آ
(قمر حجازی)

تو بھی تنہا ہے میں بھی تنہا ہوں
میرے محبوب کچھ کیا جائے
(حیدر علی سحر)

سر پہ رکھی ہوئی تقدیر کے ہوتے ہوئے بھی
کتنا بھاگا ہوں میں زنجیر کے ہوتے ہوئے بھی
آج تنہائی نے تنہائی کا طعنہ دیا ہے
دکھ تو یہ ہے تری تصویر کے ہوتے ہوئے بھی
(سخنور نجمی)

روش کی 52ویں شعری نشست

گوجرہ کی معروف ادبی تنظیم ''روش'' کے زیرِ اہتمام معروف شاعر اور صحافی ارشد محمود ناصر کے اعزاز میں 52 ویں شعری نشست دی ایلیٹ سکول، موگی روڈ میں منعقد ہوئی۔ صدارت سید اجمل شاہ بخاری نے کی۔ مہمان اعزاز عبدالرحمٰن زاہد تھے۔ نقابت غزالی نے کی۔ دیگر شعراء کرام جنھوں نے شرکت کی اُن میں عامر ابرار علوی، جمیل عاجز، ماسٹر ناظر حسین ناظر، چاند عطاری، صدیق نجمی، محمد اویس، قاری سردار محمد، بشارت علی ساحر، وارث اعجاز، ماسٹر ذوالفقار علی مشتاق، بشیر ربانی، عامر ریاض، فاروق عابد، انور ندیم اور عبدالرحمٰن پاشا شامل تھے۔ نشست کے آخر میں صاحب شام ارشد محمود ناصر سے کھل کر کلام سنا گیا۔ مذکورہ نشست ایک یادگار نشست تھی۔

فرتاش سید کے اعزاز میں

گزشتہ دنوں آرٹس کونسل اوکاڑا میں معروف شاعر پروفیسر فرتاش سید کے اعزاز میں ایک کل پنجاب محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈی۔او۔سی بلال فیروز جوئیہ نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی قومی سیرت ایوارڈ یافتہ شاعر و ادیب پروفیسر سید ریاض حسین زیدی اور ملک کے ممتاز شاعر، ادیب اور سفرنامہ نگار حسن عباسی تھے۔ مہمانِ اعزاز معروف شاعر، دانشور اور نقاد و محقق پروفیسر افتخار شفیع اور دبنگ لہجہ کے شاعر اوصاف شیخ تھے۔

مشاعرہ کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کی سعادت حافظ فضل الرحمٰن جبکہ ہدیۂ نعت بحضور سرور کائنات قاری و حافظ عمر فاروق نے بارگاہ خیر الانام میں پیش کیا۔ جبکہ نظامت کے فرائض حسرت بلال نے ادا کیے۔ مہمان خصوصی حسن عباسی، پروفیسر افتخار شفیع اور ندیم ناجد نے پروفیسر فرتاش سید کے فن و شخصیت پر اظہار خیال کیا اور عدیل جدران نے مترنم غزل پیش کی۔ مشاعرہ میں پنجاب بھر سے معروف شعرائے کرام نے شرکت کی۔ جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں عاکف عثمان عاکف، اکرم دانش، احتشام شامی، مصطفیٰ مغل، سلمیٰ رُباب، صدیق ثانی، قمر حجازی، عبدالستار، امین انجم، اقبال فریدی، املاک احمد جدران، فضل احمد خسرو اور پروفیسر احمد ساقی شامل ہیں۔ ان سب کا شمار اوکاڑا سے ہوتا ہے۔ جبکہ پنجاب کے دیگر شہروں سے جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں کاشف حنیف، تحصیل شیخ، خلیل الرحمٰن خلیل، سہیل انجم شہزاد، اقرار مصطفیٰ، علی وارث انصاری، احمد کامران، ندیم ناجد، پروفیسر افتخار شفیع، مظہر بخاری اور اوصاف شیخ شامل ہیں۔

مشاعرہ کے اختتام پر اپنے صدارتی کلمات میں ڈی او سی بلال فیروز جوئیہ نے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر اوکاڑا آرٹس کونسل اوکاڑا سید ریاض ہمدانی کی اس کاوش کو خوب سراہا اور فنون لطیفہ کی ترویج کے لیے ایسے اقدامات کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے خاص طور پر چوہدری سلطان محمود گجر کے تعاون کو خوب سراہا۔

تقریبات

ادب سرائے ساہیوال کے زیر اہتمام ۲۵۷ ماہانہ نعتیہ مشاعرہ صدر ادب سرائے پروفیسر سید ریاض حسین زیدی کی اقامت گاہ فرید ٹاؤن میں زیر صدارت ونگ کمانڈر کرنل مظفر علی منعقد ہوا۔ میاں عبدالستار اور شیخ فیاض مہمانانِ اعزاز تھے۔ حسرت بلال حسرت نے نقابت کے فرائض بہ احسن انجام دیے۔ پروفیسر زاہد ظہور کی تلاوت کلام پاک کے بعد پاکستان کے عظیم نعت خواں احمد علی حاکم، علی رضا اور افضال حسین سہروردی نے سید ریاض زیدی، احمد ندیم قاسمی اور ریاض الدین سہروردی کا نعتیہ کلام خوبصورت اور دل موہ لینے والے ترنم کے ساتھ پیش کیا۔ نعتیہ مشاعرہ میں سید ریاض زیدی، علی رضا، غضنفر عباس سید، احمد علی حاکم، مرتضیٰ ساجد، شمشیر حسین زاہد اور فاروق اظہر نے اپنے نعتیہ اشعار سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ صدر مشاعرہ کرنل مظفر علی نے نعتیہ مشاعرہ کے اعلیٰ معیار کو سراہا اور ادب سرائے ساہیوال کی ادبی سرگرمیوں اور فروغ حمد و نعت کاوشوں کی مدح سرائی کی۔

ادیب اور کالم نگار رسول احمد کلیمی انتقال کر گئے

(کراچی) معروف ادیب اور کالم نگار رسول احمد کلیمی ٹورنٹو (کینیڈا) میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کینیڈا میں نیشنل بینک آف پاکستان کے سابقہ چیف ریپریزنٹیٹو تھے۔ رسول احمد کلیمی نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ آپ نے شاعری کی صنف میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ آپ کی نعتیں مقبول عام ہوگئیں۔

بیرون ملک مقیم شعراء کی پاکستان آمد

ان دنوں اٹلی میں مقیم معروف شاعرہ شازیہ نورین دوحہ قطر سے فرتاش سید، قیصر مسعود اور ممتاز راشد، کویت سے بدر سیماب اور سجاد جبکہ دبئی سے امجد اقبال امجد اور سلمان جاذب پاکستان آئے ہوئے ہیں اور ان کے اعزاز میں مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے تقاریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔

سفید چھڑی

ڈاکٹر شیخ اقبال کی زیر ادارت ماہنامہ ''سفید چھڑی'' چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔

تارکین وطن

ماہنامہ ''تارکین وطن'' ماہ جولائی کا تازہ شمارہ مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

چہار سو

ماہنامہ ''چار سو'' اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ پاکستان کے چار سو دستیاب ہے۔

خیال و فن

لاہور اور قطر سے بیک وقت شائع ہونے والا سہ ماہی ''خیال و فن'' چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔

شاداب

چیف ایڈیٹر کنول فیروز کا معروف ماہنامہ ''شاداب'' چھپ کر مارکیٹ میں دستیاب ہے۔

محفل نعت

پچھلے دنوں ''محفل نعت'' کے زیر اہتمام وفاقی دارالحکومت میں بلاتعطل 286 واں ماہانہ نعتیہ مشاعرہ محمد محمود الزماں کی میزبانی میں منعقد ہوا۔ معروف شاعر و ادیب اور محقق پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر نے محفل کی صدارت جبکہ ناظم مشاعرہ عرش ہاشمی تھے۔ شعراء کی کثیر تعداد نے اس محفل میں شرکت کے ذریعے ہدیہ نعت پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

ٹھٹھہ میں مزاحمتی مشاعرہ

سندھ رائٹرز و تھنکرز فورم کی جانب سے مکلی میں جام نظام الدین اور دولہا دریا خاں کے مقبروں کے سامنے ''مزاحمتی مشاعرہ'' نامور شاعر حافظ محمد خان نظامانی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں سندھ کے نامور شعراء، امداد حسینی، جمن دربدر، اشتیاق انصاری، خیر محمد قوی، اشرف بھلی، خلیل کھوسو، اسماعیل اُداسی، بیدل سرور، سجاد میرانی، آپا مریم مجید سمیت نے شرکت کی۔

ادبی میگزین، کہکشاں انٹرنیشنل کی تقریب

کلر سیداں! حرف اکادمی راولپنڈی کے زیر اہتمام حرف کے سہ ماہی ادبی میگزین کہکشاں انٹرنیشنل کی تقریب رونمائی منعقد کی گئی۔ جس کی صدارت معروف ادیب جناب ڈاکٹر رشید امجد نے کی۔ مہمان خصوصی میں نسیم سحر اور ڈاکٹر روش ندیم شامل تھے۔ حرف اکادمی کے چیئرمین کرنل سید مقبول حسین نے کہا کہ ہم اس ادبی پرچے کہکشاں انٹرنیشنل کو ایک معیاری پرچہ بنانا چاہتے ہیں جس کے لیے ہمیں شاعر اور ادیب حضرات کے تعاون کی ضرورت ہے۔

مکالمہ کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست کا اہتمام

پشاور کی معروف ادبی تنظیم 'مکالمہ' کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف شاعر اور ادیب سہیل انجم نے کی۔ تقریب کے پہلے حصے میں ڈاکٹر اظہار اللہ اظہار کی غزل کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ بعدازاں حسب روایت اردو، پشتو اور ہندکو مشاعرہ معروف شاعر اور اکادمی ادبیات پاکستان پشاور کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر سید ولی خیال مہمند کی صدارت میں ہوا۔

انگریزی زبان کے پاکستانی شاعر کے لیے دو بین الاقوامی اعزازات

(اسلام آباد) انٹرنیشنل پوئٹری ٹرانسلیشن اینڈ ریسرچ سنٹر چائنا اور دی ورلڈ پوئٹری موومنٹ یو ایس اے نے اس سال انگریزی زبان کے پاکستانی شاعر محمد شاور کو بالترتیب انٹرنیشنل بیسٹ ٹرانسلیٹر پرائز 2012 اور بیسٹ پوئٹ 2012 سے نوازا ہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی برسی

(اسلام آباد) عظیم شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی 35 ویں برسی منائی گئی۔ انہوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ تحریر کیا۔ ان کا شمار 20 ویں صدی کے اہم ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تین زبانوں اُردو، پنجابی اور فارسی میں شاعری کی۔ انہیں 1966ء میں حکومت ایران کی طرف سے تمغہ سپاس اور حکومت پاکستان کی طرف سے ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔

اسلامیہ کالج سول لائنز کا نعتیہ مشاعرہ

گورنمنٹ اسلامی کالج سول لائنز میں ایک نعتیہ محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ صدارت پرنسپل کالج ہذا ڈاکٹر علی ظہیر منہاس نے کی۔ جبکہ ڈاکٹر خورشید رضوی مہمان خصوصی تھے۔ شعراء میں ڈاکٹر فخر الحق نوری، مرغوب حسین طاہر، ڈاکٹر ضیا الحسن، سعود عثمانی، سعد اللہ شاہ، حسن کاظمی، سلیم الرحمٰن، جمشید چشتی، تیمور حسن تیمور، مظفر بلوچ، احتشام علی، آصف مغل اور کامران ناشط تھے۔

تبصرۂ کتب

نام کتاب: ثنائے سرورﷺ صفحات: 168 قیمت: 300 رائے: خورشید رضوی ناشر نستعلیق پبلی کیشنز فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور	نعت کے فنِ شریف سے علی رضا کی مناسبتِ طبع اُس کی شعر گوئی کی ہم عمر ہے کہ اُس کی اولین شعری تخلیق نعت ہی کی صورت تھی۔ یہ توفیقِ ازلی جادۂ زیست پر مسلسل اُس کے ساتھ رہی ہے۔ اس کا ظہور کبھی نعت خوانی کے سوز میں ہوا اور کبھی نعت گوئی کے گداز میں۔ ''درود اُن پر سلام اُن پر'' کے عنوان سے معاصر نعت کا ایک منفرد انتخاب بھی علی رضا کے اسی میلانِ قلبی کا ایک رُخ ہے اور اب اُس کا اپنا مجموعہ نعت ''ثنائے سرورﷺ'' گویا اس کشتِ سعادت کا گلِ سربد ہے۔ علی رضا کے ہاں اساسِ نعت جذبۂ والہانہ پر اُستوار ہے۔ وہ ذات کے شعور اور دل کے گداز دونوں کا سرچشمہ اُس ذاتِ والا صفات کو تصور کرتا ہے جس کا اسمِ مطہر ہر قدم پر اُس کا رہما ہے اور جس کے لائے ہوئے دستور سے زمانہ منقلب ہو گیا۔ علی رضا کے نزدیک سوچوں کو باوضو رکھنا آدابِ نعت گوئی میں شامل ہے۔ حضورﷺ کی شانِ رحمۃ للعالمینی اُس کے خیال میں فراخ دلی اور رواداری کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ جس کسی کو حبِ نبیؐ عطا ہو جائے اُس کے دل میں بغض اور کینے کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ سیرتِ رسولؐ کے تصور کو تلاوتِ کریم کے مترادف سمجھتا ہے۔ سبز گنبد اُس کے خیالوں میں فانوس کی طرح روشن ہے اور یوں اُسے دوری میں بھی حضوری کی نعمت حاصل ہے۔ خیالوں میں روشن سبز گنبد میں گھر بیٹھے زیارت کر رہا ہوں
نام کتاب: لمحہ موجود صفحات: 144 قیمت: 250 روپے تبصرہ نگار: ناز اوکاڑی پبلشرز: سانجھ پبلی کیشنز، بک سٹریٹ 46/2 مزنگ لاہور	''لمحہ موجود'' جدید شاعری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ یہ مجموعہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ شاعر کی اس سے پہلے 4 کتابیں چھپ کر قارئین سے داد پا چکی ہیں۔ فضل خسرو صاحب اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔ اوکاڑا کے نامور شاعر، نثر نگار اور قاری کے استاد اقبال صلاح الدین مرحوم کے شاگردِ رشید ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں رومانیت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں ہونے والی اتھل پتھل پر بھی گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ غزل اور نظم دونوں کو یکساں مہارت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ فضل احمد خسرو کی ''لمحہ موجود'' میں زیادہ تر شاعری نظم پر مشتمل ہے۔ اپنے معاشرے میں رہتے ہوئے عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں یا نام نہاد جمہوری علمبرداروں کی جور و ستم جو نیتے، غریب ملکوں کی عوام پر کیے گئے پر بھی گہری نظر ڈالتے ہوئے اپنے احساسات نظم کے ذریعہ عالمِ انسان تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ بھی پڑھ کر یقیناً متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔
نام کتاب: بچے جبر کے سائے میں صفحات: 278 قیمت: 500 روپے تبصرہ نگار: ناز اوکاڑی پبلشرز: ادارہ ماہنامہ ملنکیہ (محلہ علی پور) اوکاڑا، پاکستان	آج کے اس مشینی جدید دور میں بھی بچوں پر جور و ستم رکھا جا رہا ہے۔ ہمارے اردگرد چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں سے لے کر فیکٹریوں تک جا بجا بچوں سے کہیں جبری اور اگر مختنانہ بھی تو برائے نام، مشقت لی جا رہی ہے۔ باوجود اس کے کہ بچوں کی عمر کا بھی تعین ہے اور اُجرت بھی۔ قانون میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ عمل درآمد نادارد، ادارے بھی موجود لیکن رسائی نہیں۔ بدقسمتی یہ کہ ان معصوم بچوں کو خود بھی علم نہیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں۔ اگر کوئی حق نہ دے رہا ہو تو فریاد کہاں کرنی ہے۔ صاحبِ دل و اولاد کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے میں اقبال محمد فریدی نے ان بچوں کے لیے آواز اُٹھائی ہی نہیں بلکہ اسے حکامِ بالا تک پہنچانے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کا یہ منفرد کام اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ اس کو منظوم کی شکل میں شائع کیا ہے۔ بابر شفیع چوہدری ان کی کاوش کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں ''محمد اقبال فریدی نے اس کتاب میں چائلڈ لیبر جیسے اہم قومی، سماجی اور اقتصادی مسئلے کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے شعروں کی زبان میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انور ملک صاحب نے عروضی لحاظ سے بھی ان کے شعری فن کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ''اقبال فریدی کا نام ایک درخشندہ ستارے کی طرح چمکے گا اور سخن ور لوگوں میں ہر آنے والا دن اقبال محمد فریدی کا دن ہوگا۔''

نام کتاب: آ ؤ بھائی کھیلیں صفحات: 200 قیمت: 400روپے تبصرہ نگار: ناز اوکاڑی پبلشرز: بک ہوم بک سٹریٹ 46مزنگ روڈ لاہور	نجم الدین احمد کا افسانوی مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کا ناول ''مدفن'' ادبی دنیا میں اپنی حیثیت منوا چکا ہے۔''آ ؤ بھائی کھیلیں'' اس مجموعہ کا نام ہے جو حال ہی میں منظر عام ہوا ہے۔نجم الدین کا بیان سادہ مگر پُر اثر ہے۔لکھنے کا انداز قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اپنے افسانوں میں نجم الدین نے اپنے اردگرد ہونے والی معاشرتی برائیوں اور کج کلاہیوں کو موٴثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔علی حیدر ملک اس مجموعہ کے بارے میں لکھتے ہیں''نجم الدین احمد کہانی کے وقوعوں کو ایک دوسرے سے پیوست کر کے انجام تک پہنچانے کا ہنر جانتے ہیں۔پھر ڈاکٹر نزہت عباسی صاحب مصنف کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔''نجم الدین کے احمد کے افسانوں کے بارے میں مجموعی طور پر بات کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے کا الٹرا ساؤنڈ کیا ہے۔
نام کتاب: کامنی صفحات: 190 قیمت: 250روپے تبصرہ نگار: ناز اوکاڑی ناشر: رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز اقبال مارکیٹ،اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی	''کامنی'' نام ہے اس کتاب کا جو حال ہی میں ادبی آسمان پر ستارہ بن کر اُبھری ہے۔نام کی طرح کومل تاکے پھول لیے شائقین ادب کی راہ میں کھڑی ہے۔نوید ملک کا پہلا نظمیہ مجموعہ ہے مگر نظمیں پڑھ کر احساس نہیں ہوتا کہ پہلا مجموعہ ہوگا۔بڑے منجھے ہوئے شاعر لگتے ہیں۔ہر نظم کا عنوان بھی عنوان کے ساتھ نظم کی ہم آہنگی ان کے پختہ شاعر ہونے کی بھی دلیل ہے۔ان کے بارے''حسن عباسی'' صاحب رقم طراز ہیں کہ''نوید کی نظموں کے اندر بھی ایک جہانِ معانی آباد ہے۔یہ سب نظمیں مجھے ایک ہی فیز میں لکھی ہوئی لگتی ہیں۔نظموں کی بے ساختگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سارا شعری سرمایہ کسی مدفون شہر کی طرح اس کے اندر پہلے موجود تھا۔پھر اک روز یہ خود بخود باہر نکل آیا۔
نام کتاب: یادوں کی بارشیں صفحات: 160 قیمت: 200روپے تبصرہ نگار: عامر بن علی پبلشرز: جمہوری پبلشرز،لاہور	نامور شاعرہ نگہل صابری کا تازہ شعری مجموعہ''یادوں کی بارشیں'' کے عنوان سے شائع ہو گیا ہے۔یہ نگہل صابری کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے۔''پانی کا گھر'' اور''روشنیوں کے رنگ'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔تازہ شعری مجموعہ غزلیات پر مشتمل ہے۔کتاب کا دیباچہ علی سردار جعفری نے تحریر کیا ہے۔ان کے علاوہ فرخ سہیل گوئندی،محترمہ بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر خورشید رضوی اور کرامت بخاری کی آراء بھی اس شعری مجموعے میں شامل ہیں۔خوبصورت چھپائی اور آرٹ کاغذ پر اس کتاب کو جمہوری پبلشرز نے لاہور سے شائع کیا ہے۔
نام کتاب: حرف رسا مرتب: اعجاز احمد قیمت: 1200روپے تبصرہ نگار: عامر بن علی پبلشرز:	حضور اکرمؐ کی دُعاؤں پر مشتمل کتاب''حرف رسا'' کو نوجوان محقق اور دانشور اعجاز احمد نے مرتب کیا ہے۔پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس کتاب کے اکتالیس ابواب ہیں جس میں آنحضرتؐ کی سینکڑوں دُعائیں شامل ہیں۔اس کتاب کو مصنف نے معروف روحانی شخصیت پروفیسر احمد رفیق اختر کا فیضان نظر قرار دیا ہے۔حرف رسا کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے حواشی و تشریحات عصر حاضر کے مستعمل اور عام فہم زبان میں تحریر کیے گئے ہیں۔نبی کریمؐ کی خوبصورت دُعاؤں کا یہ گلدستہ''بیت الحکمت'' پبلشر نے شائع کیا ہے۔کتاب کی قیمت 1200 روپے ہے لیکن میاں چنوں سے تعلق رکھنے والے محقق اور دانشور اعجاز احمد جنھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ یہ کتاب ہر مسلمان تک تحفتاً پہنچانے کی خواہش رکھتے ہیں۔رسول اکرمؐ کی دُعاؤں کو اکٹھا کرنا اور خوبصورت کتاب کی شکل میں شائع کرانا بلاشبہ ایک عظیم سعادت ہے اور اہل ایمان تک تحفتاً پہنچانا ایک عظیم نیکی ہے۔
نام کتاب: اکھ دا چ صفحات: 104 قیمت: 150روپے تبصرہ نگار: ناز اوکاڑی پبلشرز: ادارہ پنجابی لکھاریاں شاہدرہ لاہور	ملک شاہ سوار علی ناصر انشائیہ مجموعہ''اکھ دا چ'' چھپ کے مارکیٹ میں آ چکا ہے۔اس پنجابی زبان کے مجموعہ میں پنجابی انشائیے ناصرف معاشرے کی صحیح عکاس ہیں بلکہ محبِ وطن ہونے کا احساس بھی دلاتے ہیں۔جمیل پال لکھتے ہیں''مختصر لفظوں میں بات کرنا انشائیے کی خوبی ہوتی ہے جو ملک شاہ سوار کے پاس ہے۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک صاحب پنجابی انشائیہ نگاروں میں اُونچا مقام ہے۔

نام کتاب: شہرگماں صفحات: 256 قیمت: 300روپے تبصرہ نگار: نازاوکاڑی پبلشرز: عوامی کتاب گھر اُردو بازار، لاہور	جمیل یوسف خوبصورت لب ولہجہ کے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ سفرنامے کے علاوہ تاریخ اور سوانح حیات تحریر کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کا نیا شعری مجموعہ "شہرگماں" منظر عام پر آیا ہے۔ غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ منفرد اسلوب میں اپنی پوری آب و تاب لیے ہوئے ہے۔ جمیل یوسف نے اپنے اسلوب اور کلاسیکی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ اُمید ہے اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے یقیناً اسے پسند کریں گے۔
نام کتاب: خاباں بھریاں اکھاں (پنجابی) صفحات: 128 قیمت: 250روپے تبصرہ نگار: نازاوکاڑی پبلشرز:	یہ آنکھیں ہی ہیں جو خواب سجا سکتی ہیں اور سجاتی ہیں۔ اعجاز احمد اعجاز کی آنکھوں نے بھی کچھ خواب سجائے ہیں جو انہوں نے شاعری زبان میں ہمیں دکھانے لائے ہیں۔ ان کے اس مجموعہ میں حمد، نعت، سلام، منقبت، ترانے، کافیاں، نظمیں اور غزلیں اپنے رنگ بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر یونس احقر اعجاز صاحب کی شاعری کے حوالے سے کہتے ہیں "اُمید کی جاتی ہے کہ کافی کے کرنٹ کی بدولت ان کی شاعری کی جلتی بجھتی روشنی کی لڑیاں ہمیشہ جگمگاتی رہیں اور خواب بھری آنکھوں کو ہمیشہ تعبیر ملتی رہے۔" مجھے اُمید ہے خاباں بھریاں اکھاں" یقیناً پنجابی قدر دانوں میں پسند کی جائے گی۔
نام کتاب: آ بیتیں صفحات: 110 قیمت: 150روپے تبصرہ نگار: نازاوکاڑی گلشن ادب 6-خیبر پارک آؤٹ فال روڈ، لاہور	عاشق رحیل صاحب ادبی دُنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ریاضی کے پروفیسر ہونے کے ناتے اُن کی اُردو ادب کے ساتھ دلچسپی حیران کرتی ہے۔ موصوف اُردو کے علاوہ پنجابی اور پشتو میں بھی اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "آ بیتیں" اُردو ادب میں ایک اور اضافہ ہے۔ اُردو انشائیوں پر مبنی مجموعہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں کل 17 انشائیے ہیں۔ ہر انشائیہ ایک جدت لیے ہوئے ہے۔ جتنے پیارے وہ خود ہیں ان کی طرح ان کی ہر تحریر پیاری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "آ بیتیں" اچھا ادب پڑھنے والوں کو یقیناً ادبی تسکین فراہم کرکے داد تحسین حاصل کرے گی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

برطانیہ ٹوٹنگھم میں مقیم معروف شاعرہ

سعدیہ سیٹھی

کی کتب

شرق کی خوشبو (افسانے) / قیمت: 200روپے

محبت آخری سچ ہے (ناول) / قیمت: 300روپے

کبھی ناراض مت ہونا (شعری مجموعہ) / قیمت: 200روپے

ناشر

نستعلیق پبلی کیشنز، الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

0331-44893[illegible]

نامور شاعر اور سفرنامہ نگار

حسن عباسی کی کتب

ہم نے بھی محبت کی ہے (شعری مجموعہ) / قیمت: 200روپے

ایک محبت کافی ہے (شعری مجموعہ) / قیمت: 200روپے

اک شام تمہارے جیسی ہو (شعری مجموعہ) / قیمت: 200روپے

محبت کے پروں میں گھنٹیاں باندھو (سفرنامہ) / قیمت: 250روپے

ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا (سفرنامہ) / قیمت: 300روپے

ناشر

نستعلیق پبلی کیشنز، الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

0331-4489310

نامہ ہائے احباب

محترم مدیر اعلیٰ جناب ماہنامہ ارژنگ، لاہور

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

ارژنگ تواتر سے موصول ہو رہا ہے۔ اس عنایت پر ممنون ہوں۔ اس رسالے کے توسط سے معیاری اور تر و تازہ، نظم و نثر کی تخلیقات پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ طباعت و اشاعت کے اعتبار سے بھی یہ بہت خوش آیند ہوتا ہے۔ مجلس ادارت دلی سپاس کی مستحق ہے کہ اتنا عمدہ رسالہ ہدیۂ احباب کرتی ہے۔

جولائی ۲۰۱۳ء کے شمارے (جلد ۱۵، شمارہ ۷) میں پروفیسر مظفر حسن منصور صاحب کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔ اس حوالے سے بھی کہ میں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں جوہر آباد کالج میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ یہ غزلیں پڑھ کر وہ یادیں تازہ ہوگئیں۔ اللہ آپ کی توفیقات میں خیر و برکت عطا فرمائے۔

مخلص

معین نظامی/ لاہور

***

حسن حسن! السلام علیکم۔

ارژنگ کا شمارہ بڑی آب و تاب کے ساتھ ملا۔ معنی خیزی حسن رنگ ہے۔ تحریروں کی حشر ساماں حشر ساماں کیفیات ارژنگ سے خاص ہیں۔ "شعری گوشے" کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔ اس حصے میں طرح طرح کے شاعروں کے سخن دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہر شاعر اپنے طور پر دوبالا نظر آتا ہے۔ گوہر ہوشیار پوری کے تغزلات آہنگ پر مضمون کو مختصر ہے مگر اچھا ہے۔ گوہر ہوشیار پوری کا شمار اساتذہ میں ہے۔ مضمون، مزاح اور افسانے اچھے لگے۔ ارشد نعیم صاحب کے خط سے بہت کچھ حاصل ہے۔ مضمون شعری ہو یا نثری اس کا جائزہ وہ وقت نظر سے لیتے ہیں۔ ادب کے سنجیدہ ترین اہل فکر میں آپ اہم رکھتے ہیں۔ معیار کے پرکھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ ارشد صاحب کو اچھی ادبی قربتیں مہیا ہیں۔ کیا بات چمن کے کہی ہے

یہ محرومی بھی میرے پاؤں سے لپٹی ہوئی ہے

افضل خان نے غزل میں کیا طرح دار لہجہ پیدا کیا ہے۔ آواز اور لہجہ ایک "انجان تاثر" کی "عجیب و غریب" خوش گواری پیدا کر رہے ہیں۔

خیر اندیش

آصف ثاقب

***

محترم عباسی صاحب! السلام علیکم

اُمید کرتی ہوں کہ آپ ہمیشہ کی طرح خیریت سے ہوں گے۔ مجھے "ارژنگ" ہر ماہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا اس بار بھی۔

حسن سرجی اور خاور سرجی کی شاعری ہم سب بہنوں کو بہت پسند ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہمیشہ کامیابی سے نوازتا رہے اور ہم سب پر نظر خاص کرے۔ آمین

نایا سحر

لالہ موسیٰ

***

برادرم جناب حسن عباسی! السلام علیکم

اُمید واثق ہے کہ رب ذوالجلال کے فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے۔ "ارژنگ" باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ بہت شکریہ کہ آپ اپنی محبتوں میں یاد رکھتے ہیں۔ ارژنگ میں نئے سلسلوں کا اضافہ بہت خوش آئند ہے۔ جیسا کہ کتب پر تبصرہ، نامہ ہائے احباب، ادبی خبریں، ارژنگ اور آپ کی مزید ترقی کے لیے۔

دُعا گو

ارشد محمود ارشد/ سرگودھا

***

محترم و مکرم جناب حسن عباسی صاحب!

سلام مسنون! خدا کرے آپ اور آپ کے اہل خانہ بخیریت ہوں۔ ایک تازہ نعت الہام ہوئی ہے ارژنگ کے لیے ارسال خدمت ہے۔ اس سے پہلے ایک نظم "کربلائیں ہی کربلائیں" بھجوائی تھی۔

کہنا یہ بھی ہے کہ دوستوں پر خصوصی عنایات کیا کیجیے۔ عید کی آہٹیں ابھی دور سے سنائی دے رہی ہیں۔ بہر حال آنے والی عید کی پُرخلوص مبارکباد!

آخر میں میرا اور مسعود احمد کا پُرخلوص سلام!

نیاز کیش

احمد جلیل

***

حسن عباسی صاحب! السلام علیکم

ارژنگ کی خوبصورت ادارت کا حق آپ بخیر و خوبی ادا کر رہے ہیں۔ اس میں پختہ کار اور نوآموز شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے جو عصری شاعری کے رجحانات کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے مختلف شعراء کے گوشے ترتیب دے کر ان کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کا بہتر اہتمام بھی کیا ہے۔ اس دفعہ ساہیوال کے جواں مرگ شاعر عبدالرحمٰن انجم کا گوشہ دے کر آپ نے مرحوم شاعر کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ علی رضا کی ارژنگ میں معاونت نہایت خوش آئند ہے۔ وہ اعلیٰ شاعر، نعت خواں اور نثر نگار ہیں۔ عبدالرحمٰن انجم مرحوم کی شاعری کی اوّلین جھلک آپ

اورعلی رضا کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

ایک نعت اور غزل ارسال ہے۔ نیز ادب سرائے کی سالانہ نعتیہ نشست کی روداد بھی بھیج رہا ہوں۔

سید ریاض حسین زیدی

❁❁❁

نازاوکاڑوی صاحب! السلام علیکم

اسد بھٹی کے ہاں "ارژنگ" نامی خوبصورت مجلہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انتہائی خوبصورت ادبی جریدہ ہے۔ اسے پہلی بار دیکھا ہے۔ "ارژنگ" میں کچھ حصہ پنجابی ادب کے لیے مخصوص کروا کر آپ نے قابل قدر کام کیا ہے۔ رب کعبہ آپ کو کامرانیاں عطا فرمائے۔ آپ جیسے محنتی انسان کی محنتوں کو داد دینا چاہیے۔

ایک کہانی "ضمیر سے چوں اواز" بھجوا رہا ہوں۔ علاوہ اس کے اپنی نئی کتاب "اکھ دا سچ" بھی ارسال ہے۔ ملنے پر مطلع فرمایئے گا۔ دُعائیں

فقط والسلام

مخلص ملک شاہ سوار علی ناصر

❁❁❁

حسن عباسی صاحب!

ارژنگ اپنی تمام خوبصورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ آپ کے حسن شوق اور حسن ذوق کی جھلکیاں دکھاتا ہوا۔ محنت اور لگن سے تیار کیا ہوا ارژنگ۔ ارژنگ بھیجنے کا شکریہ۔ شعری گوشے میں شامل کرنے کا شکریہ۔ جیتے رہیے خوش رہیے۔

ایک افسانہ پروٹوکول حاضر ہے۔ "سرگوشی" پہ تبصرے کی منتظر۔

تسنیم کوثر

❁❁❁

جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "ارژنگ" لاہور

اسلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ایک افسانہ (غیر مطبوعہ) ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے کرم فرمائی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ادب کے حوالے سے آپ کی کوششوں پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

رانا محمد یعقوب

❁❁❁

پیارے محترم حسن عباسی! اسلام مسنون

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ جولائی ۲۰۱۳ء کا شمارہ ملا۔ پڑھ کر انتہائی مسرت ہوئی۔ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو اتنا خوبصورت، معیاری اور لاجواب پرچہ نکالنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

محترمہ صغریٰ صدف کا "حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے" بہت ہی خوبصورت انداز میں تحریر کیا گیا۔

جناب عطاء الحق قاسمی کا لنڈا اور ٹھنگے، گل نوخیز اختر کا بونا نہیں بیوقوف بہت ہی خوبصورت تخلیقات اور نہایت عمدہ۔

محترمہ عذرا اصغر کا افسانہ غم کا پچھلا پہر میں انہوں نے جو بیان کیا نہایت ہی سلیقہ مندی سے کام لیا۔

محترمہ سلمیٰ اعوان کا سفر نامہ "روسی عورت کے شب و روز" میں پاکستانی اور روسی عورت کا جو تقابلی جائزہ پیش کیا بہت خوب رہا۔

آپ کی نظموں کی Translation بہت ہی عمدہ اور لاجواب تھی۔ اپنی ایک تازہ غزل ارسال کر رہا ہوں۔ معیار پہ اُترے تو شامل کر دیں۔ شکریہ

والسلام

جابر نظامی

بھوئی گاڑ، حسن ابدال

❁❁❁

میرے اپنے بھائی حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ ارژنگ کو رسالہ کہنا بددیانتی ہوگی۔ یہ تو ادب کی دستاویز ہے۔ جسے سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ارژنگ ادبی رسالوں کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ حسن ادارت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مشمولات بھی معیاری اور ادب کی نئی سمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ الفاظ تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ بس دعا ہے کہ ارژنگ اسی طرح نئی منزلوں سے آشنا ہو۔ آپ کی کرم فرمائی کے لیے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنا سمجھا۔ حق بات یہ ہے کہ آپ کی شاعری کی انفرادیت، وہ انداز تکلم جو پینترے کاٹ کر اظہار کا الگ راستہ بنا لیتا ہے اُس نے مجھے کب سے اپنا بنا رکھا ہے۔ اب اس شعر کو ہی لے لیجیے۔

اپنی دہلیز پہ کچھ دیر پڑا رہنے دے
جیسے ہی ہوش میں آؤں گا چلا جاؤں گا

ایک بات پوچھوں۔ جب آپ یہ شعر کہہ رہے تھے آنکھیں گیلی نہیں ہو گئی آپ کی؟ پڑھتے وقت میری آنکھیں کیوں گیلی ہو گئیں؟ شاعری کیا ہے۔ فن کا آنکھوں سے کیا واسطہ ہے۔ یہ ساری باتیں انشاء اللہ لکھوں گا جو آپ کی شعریات سے ملی ہیں۔

دستگیر شہزاد

ٹوبہ ٹیک سنگھ

❁❁❁

محترم جناب ایڈیٹر صاحب حسن عباسی!

سلام خلوص۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کے ارژنگ نے تو دھوم مچا دی ہے۔ رسالہ آنے سے پہلے مجھ سے زیادہ محلے کی لڑکیوں کو حسن عباسی کے پرچے کا انتظار رہتا ہے۔ خوبصورت شاعری سے مزین۔ من موہنے رنگین تتلیوں جیسے رنگوں سے سجے خواب خواب افسانے انتہائی قابل دید ہوتے ہیں۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی پچا نا ئز ہو جاتے ہیں اور پھر کوئی لاکھ آوازیں دیتا رہے۔ مہمان سر پہ آ کھڑے ہوں ہم گم ہوتے ہیں اپنے پیارے سے ارژنگ میں جسے آپ بڑی محنت سے سجاتے ہیں۔

نسیم سکینہ صدف

پنجاب تے پنجابیاں نال دھرو

محمد علی اسد/ہڈالی خوشاب

اسیں کہنے آں کہ پنجاب تے پنجابیاں نال ہمیش ای دھرو کیتا گیا اے تے کوئی اے دس سکدا اے کہ دھرو کوئی باہروں آ کے کردا اے یا اسیں آپ ای پئے کرنے آں میں تے سمجھناواں پنجابی نال اے دھرو کوئی باروں آ کے نئیں کردا اسیں آپے ای کرنے آں سندھ، بلوچستان، تے خیبر پختونخواہ چھوٹے صوبے ہون پاروں وی اپنی پچھان رکھدے نے اناں دی بولی وی اپنی اے تے اناں صوبیاں چہ بالاں نوں مڈھلی تعلیم وماں بولی وچہ دتی جاندی اے جدکہ پنجاب اناں تناں صوبیاں نالوں وڈا صوبہ اے تے اس دی آبادی وی اناں تناں صوبیاں نالوں زیادہ اے اناں دی آبادی اٹھ کروڑ اے تے پنجاب کلے دی آبادی دس کروڑ اے۔

پنجابی دس کروڑ لوکاں دی بولی ہون پاروں وی مظلوم تے لاوارث اے تے ایدی اپنی کوئی پچھان نئیں پنجاب تے ماں بولی نوں اے پچھان کے باہروں آ کے دینی اے یا اپنی پچھان پنجابیاں آپ کروانی اے کی پنجابی نوں ایدا حق پشتو، سندھی یا بلوچی والے آ کے دین گے یا اے حق پنجابیاں آپ ای لینا اے کی اج تیکر پنجاب دے جنے وی وزیر اعلیٰ تے گورنر آئے نے او ایتھوں دے نئیں سن کی اے سارے باہروں آئے نے۔

ہر بندے نوں اپنی دھرتی تے اپنی ماں بولی نال قدرتی پیار ہوندا اے پر افسوس تے ایس گل دا اے کہ پنجاب دے سیاستداناں، اسمبلیاں دے ممبراں تے حاکماں نوں نہ اپنی دھرتی ماں نال پیار اے تے نہ ای اپنی ماں بولی نال میں تے سمجھناواں کہ شاید اناں نوں اپنی جمن والی ماں نال ای پیار نئیں تے شاید اناں اپنی ماں دا دودھ ای نئیں پیتا جے اناں اپنی ماں دا دودھ پیتا ہوندا تے اناں نوں اپنی دھرتی نال پیار ہندا تے اے اپنی ماں دے دودھ دی لاج رکھدے تے اپنی ماں بولی دی قدر تے مان ودھدا ندے اج ساڈی اپنی وی کوئی پچھان ہوندی تے ساڈی ماں بولی وی کسے بیوہ وانگوں نہ رلدی پھردی۔ دھرتی ماں نال دھوکہ تے دغا بازیاں کرن والے اج ساڈے حاکم بنے پھردے نے تے اساں وی کنے بے حس تے بے ضمیرے جہے ہو گئے آں کہ فیر وی اناں دے ای نعرے لائی جانے آں جے کہ پنجاب دے حاکم غیرت مند ہوندے تے اناں نوں کسے ہور پاسے ویکھن دی لوڑ نئیں سی اے خود ای پنجابی نوں صوبائی زبان دا درجہ دے کے لاگو نئیں سن کر سکدے۔ میرا تے خیال اے اناں دیاں نظراں وچہ دس کروڑ پنجابی بندے نئیں ڈھور ڈنگر نے جناں نوں ڈنڈے نال جیہڑے پاسے مرضی لے جاؤ اے اے پاسے ای سر سٹ کے ترپین گے۔ پاکستان بنن گھروں جے کراج تیک پنجابی نوں ایدا حق نئیں ملیا تے ایس وچہ سارا قصور پنجابیاں دا اپنا اے ہور کسے دا کوئی دوش نئیں کیوں جے اسیں سارے ای ماں بولی لئی گلاں تے وڈیاں کردے ہاں وڈے وڈے نعرے ماردے ہاں پر احساس کمتری دا شکار ہو کے اسیں آپ ای پنجابی نوں ان پڑھاں تے جاہلاں دی بولی بجھن لگ پئے آں کی وارث شاہؒ، غلام فریدؒ، سلطان باہوؒ تے میاں محمد بخشؒ ورگے بزرگاں دی بولی ان پڑھاں تے جاہلاں دی بولی اے۔ میں تے دکھوے نال کہناں واں کہ اج جنے وی لوک پنجابی دے موڈھی تے اگوان بنے پھردے نے او پہلاں اپنے گھرتے جھاتی مارن اناں دے اپنے گھر تے اردو تے انگریزی بولی جاندی اے پر گھروں باہر نکلدیاں ای او ماں بولی دے نعرے لان لگ پیندے نے سانوں کسے پینٹ شرٹ والے دے سامنے پنجابی بولدیاں شرم آندی اے کسے دفتر وچہ دی پنجابی وچہ گل کردے شرماندے ہاں اپنے بالاں نال وی اسیں پنجابی وچہ گل نئیں کردے اے احساس کمتری نئیں تے کی اے۔

جے کر اسیں سارے پنجابی کٹھے ہو کے اپنے اگواناں تے حاکماں دی پوچھل مروڑی رکھدے تے اج ساڈی ماں بولی وی دوجے صوبیاں وانگوں پنجاب دی سرکاری زبان ہوندی تے ساڈے تعلیمی اداریاں تے دفتراں وچہ لازمی لاگو ہوندی۔ کی اپنی ماں بولی لئی یا ایتھوں اپنے بالاں دی مڈھلی تعلیم بنان لئی وی سانوں اقوام متحدہ امریکہ یا گوریاں توں اجازت لینی پئے گی جدکہ اقوام متحدہ دے منشور وچہ تے ہر بچے دا اے جماندرو حق اے کہ اوہنوں اودی ماں بولی وچہ ای مڈھلی تعلیم دتی جائے۔ پر کی کریئے چونٹھ ورہے گزرن گھروں وی اسیں اپنے گلے چوں غلامی دا پٹہ نئیں لا سکے تے اجیں وی اسیں دوجیاں ولے ویکھ رہے ہاں کہ کوئی دوجا آ کے ساڈی ماں بولی نوں ایدا حق دے۔ اسیں آپ تے کجھ نئیں کرنا۔ میں تے دھرتی نوں ماں تے ماں بولی نوں بھین سمجھاناواں تے جس کلی بھین دے دس کروڑ ویر ہون تے فیر وی اورلدی تے دھکے کھاندی پھردی ہووے تے اوہنوں اپنے ہی گھروں دیس نکالا دے چھڈیئے تے فیر اوناں دس کروڑ ویراں دی غیرت تے انکھ دا جنازہ چک کے کھوہے سٹ چھڈنا چاہیدا اے۔

پنجاب رنگ

میرے سارے کم کسوترے
میری ساری کھیڈ اُپٹھ
میں ڈھونڈاں انت زمیناں دا
اتے اسماناں دی گٹھ
میری اکھیاں رووَن چاننی
میرے دل وچ جگے ہنیر
میں رات دے پربت پہاڑ دا
میں بھالدا پھراں سویر
میری ہیراں ساویاں ساویاں
پر دل دیاں شیر دلیر
کدی کھیڑیاں نال نہ لڑدیاں
کدی مرن نہ کردیاں دیر
میرے رانجھے بالدے ہڈیاں
اوہ تاں زہر دی چوریاں کھان
کدی بھیس نہ بدلن جوگیاں
سدا رکھ دے عشق دا مان
جدوں جھوٹھ کرے مہاراجیاں
مینوں چڑھدا حق دا تپ
میرے گل وچ پھاہی پیار دی
میرے منہ وچ سچ دا سپ

احمد ندیم قاسمی

کوٹھے جا کے ای دوستاں نے پچھان کیتی
بے سادی جھولی نیں پھٹ پرانے بے پھیر پچھو
اجیہی کیتی اے ٹہل سیوا محبتاں دی
کدے پواندی، کدے سرہانے بے پھیر پچھو
اُداس تانگھاں نے سوڑ چاڑھی، کمال چاڑھی
جدوں وی یاداں نے تنبو تانے بے پھیر پچھو
ایہہ سنیا ہوندا ایں، ناں دے اقبال ہاں اسیں وی
اسیں کدے وی نہیں ہاسے مانے بے پھیر پچھو

اقبال صلاح الدین

نہ رستے ختم ہندے نیں نہ منزل نیڑے ڈھکدی اے
سدا جیوے دلے دی آس تھکدی اے نہ رکدی اے
کھڑے ہوون بے کجھ تارے تے دو باتاں ای کر لیے
نہ چپ دا تاپ ٹٹ دا اے نہ غم دی رات مکدی اے
میں اپنے پیار دے شہروں ایہہ کیہ تحفے خریدے نیں
نہ ہوٹھاں توں رُسن ہاواں نہ اتھر اکھوں سُکدی اے
پھلے ہوئے اپنے رُکھاں دے میں میوے کسطراں توڑاں
نہ باہواں میریاں لمیاں نہ کوئی شاخ جھکدی اے
بھلاواں میں گلے سارے اُلا ہے توں دی چھڈ بجھاں
زمانہ تینوں بھردا اے ایہہ دُنیا مینوں چکدی اے
کدی اکھاں نے کہہ چھڈی کدی چپ نے بیانی اے
عجب اے داستاں دل دی لکایاں وی نہ لکدی اے
میں کہوی سا لی لے جاواں اس درداں دی ماری نوں
حیاتی پیلی سرھیوں اے تے کناں خون تھکدی اے
خدا جانے توں کاشر یار کاہدا کھٹیا کھانا ایں
نہ تینوں سچ جیون دا نہ تیری بات تھکدی اے

سلیم کاشر

سدھراں ٹوٹے ٹوٹے تکن
صدیاں دے پندھ کھوٹے تکن
سپنے گئے نہیں پالے گئے
پُرپُر وجھے پولے تکن!
جنے لے نیں پرچھانویں
اونے ای دُکھ چھوٹے تکن
جھوٹھے روتے روندیاں دے ہن
نیر سکوں کجھ موٹے تکن
ہن نہیں سراں نے کجیا جانا
چنیاں نوں لکھ گوٹے تکن

یونس احقر

دریا پار جھناں دے پچھے
خورے کیہڑا کندی کچھے
اکھ ہنیرے وچ وی یارو
سوہنی اکھ نوں سبھ کجھ دسے
پھری خونی چھل دے کولوں
اوہدے اتھرو وی نہ بجھے
کچ مٹی دا لوہا چیندا
بن اگی دے کجھ نہ رہے
ع تے ش تے ق نیں کٹھے
عشق دے نہیں بے ہندے اچھے
اچا ساہ نہیں لینا بھاویں
لوں لوں سولاں اندر وجھے
مر جانا پر غم نہیں کھانا
پھوڑی بھاویں گھر اج وجھے
انت اخیر رفیق دا اکو
سانجھ دے بے پڑھ تو قصے

رفیق کاشمیری/اوکاڑا

پنجاب رنگ

چندری رُت دا گاؤن

رُکھاں دے پرچھاویں کنّن
دھرتی ٹھنڈی ٹھار
سکھر ڈپہرے، رات دے پہرے
پت جھڑ جیہی بہار
کونجاں دی تھاں انبراں اُتے
گرجھاں بنھی ڈار
زوح دی ڈھونی مرچاں ڈھوڑے
نت ہوئی دی وار
ویلے دی کندھ ڈِٹھاں آ گئے
جیون دے دن چار
کھاٹے وادھے کھاندا جاوے
عشقے دا بیوپار
گھٹ گھٹ کچیاں گنڈھاں لاون
رُتاں ورگے یار
پکھاں باجھ پکھیرو کھیڈن
"نویوں نویں بہار"
"جو آیا، سو آیا" لوکا
اندروں آپے باہر

افضل ساحر/لاہور

باگاں دے وچ پھردیاں مینوں مدت ہوئی
پھر وی کدے نہ پھل توڑن دی ہمت ہوئی
کھسھ گیا ساں لک لک تائیں کھوبے اندر
مینوں اپنے آپ توں ڈاڈھی نفرت ہوئی
چنگا سی، اک واری پھیرا پا جاندوں
رووَن نوں میں ترس رہیاواں مدت ہوئی

چانن اپناں چار چوفیرے لڑی پاوے
نیندر مانن دی نہیں کدے وی جرأت ہوئی
کسے نہ آ کے پچھیا، درد حویلی اُتے
کنی لاگت آئی، کنی محنت ہوئی
اُس بے دردنوں پھیر وی ترس نہ آیا بھاویں
رو رو کے جوہ اکھیاں رتو رت ہوئی
پکیاں فصلاں اُتے ورہیا بدل کالا
میریاں باہواں دی ہر کھچل اوگت ہوئی

محمد شریف آرپن/لاہور

دکھ درداں دی ماری آئی
روگ وڈان وچاری آئی
جیوں جیوں سائنس ترقی کیتی
نویوں نویں بیماری آئی
جے کر نہیں سی آونا اوہنے
کاہنوں رُت بہاری آئی
روٹی ٹکر مچھن دے لئی
مردم فیر شماری آئی
موہڈے چک کے خالم خالی
گھر ول بھکھ پٹاری آئی
سماں بیٹھ رعایاں مدھی
محلوں باہر سواری آئی
داج بغیر ویاہی ووہٹی
پیکے پرت کنواری آئی
ہر کوئی ہجر بیماری ڈنگیا
کلی جان اناڑی آئی

چوراں وانگ جنید اکرم فیر
گھر وچ چوکیداری آئی

محمد جنید اکرم/لاہور

ہر شے دا توں مالک رہا! ہر شے باندی تیری
اپنے ورھیاں دے وچ میری جان بنی نہ میری
پنج ست مرلے اُتے کناں ایتھے ای پئیاں رَسن
ڈیڈھ کو گز دی آخری میری بن جانی ایں ڈھیری
ازلاں توں لے ابداں تیکر نام تیرا ای رہنا
چار کو دن دی میری ایتھے جوگیاں والی پھیری
چنگا ہوندا جے میری وی مانگ کوئی بھر جاندا
اوس گھر پتھر وچدے ای رہندے ہووے جتھے بیری
مِتھن منزل تیک ہمیشہ مرد میداناں والے
جھکھڑ یا طوفان پئے جھلن یا جھلے پئی نھیری
وقت نزع دا آیا سر تے ساقی! گھٹ لوا دے
سے خوراں دی توبہ وی کس ہوندی ہیرا پھیری

محمد جنید اکرم/لاہور

یار بناواں ڈر لگدا اے
روگ ودھاواں ڈر لگدا اے
اپنی ہتھیں سپاں تائیں
دُدھ پلاواں ڈر لگدا اے
باہر ضیاں لٹ لیندے نیں
گھر وی جاواں ڈر لگدا اے
ھن تے ایتھے جنہوں وی میں
کول بٹھاواں ڈر لگدا اے

پنجاب رنگ

جی کردا اے سچیاں سچیاں
کھول سناواں ڈر لگدا اے
بھائیا ایہناں لوکاں نوں میں
کیہ سمجھاواں ڈر لگدا اے
رب دی قسمے حسن تے ساجد
مسجد جاواں ڈر لگدا اے
حافظ افتخار ساجد/ اوکاڑا

ودھوارنگی مانگ

اودھا جیون لکھیا ساڈا
دے عشقے دی بانگ
اودھا جیون لے گئی سجنو
یار ملن دی تانگھ
سارا جیون وسیا مینوں
ودھوارنگی مانگ
اجمل خیال/ بہاول نگر

حسن دا چشمہ

ویراں دے وچ جھانجھر پا کے
اکھیاں دے وچ کجلا لا کے
بلھیاں دا وی رنگ وٹا کے
چال شرابیاں وانگ بنا کے
آسے پاسے جھاتیاں پا کے
شام سے نوا اُٹردی ناری
لگدا اپنے دل توں ہاری
حسن جا چشمہ ازلوں جاری
اجمل خیال

درد پرانے چھیڑ نہ سجناں
مینوں ہور ادھیڑ نہ سجناں
آیا ایں کجھ دیر تے بہو
چھیتی گل نبیڑ نہ سجناں
قد میں لکیاں سینے لا
منہ تے مار چپیڑ نہ سجناں
بیلا، چوری، قدمی، رانجھا
ہن گلاں دی ہیر نہ سجناں
ماڑے دے کی چھپے نا تویں
جھگڑے دی کوئی چیز نہ سجناں
زہر جاون گی آں سکھے یاداں
کھوہ نیناں دا گھیر نہ سجناں
ستا رہو توں گاڑھی نیندر
اکھیاں اجے اگھیڑی نہ سجناں
صابر وچ گناہواں بوہتا
اپنا آپ لبیڑ نہ سجناں
محمد صدیق صابر/ننکانہ صاحب

کجھ ساڈے نال وی رس تے سہی
کیہ پچھتاوا اے دس تے سہی
روگاں کولوں آپے بچ لئیں
توں ایس کڑکی پھس تے سہی

رُسیا اے تے من جاوے گا
توں پیار دی چونڈی کس تے سہی
پیار فریبی آکھی جاوے
بچ جاویں گا توں نس تے سہی
چپ ویں تاں تیری مرضی
ایہہ سوال تکھیاں مس تے سہی
تاں مناں جے اکھ چوں نکلیں
اج تھوڑا جناں ہس تے سہی
ایویں جوگ رمائی پھرداں
کجھ لبھیا اے تاں دس تے سہی
اکو اکھ اشارہ کر کے
اج پھیر املاک نوں ڈس تے سہی
املاک احمد چدران/ اوکاڑا

میری اکھاں توں وچھڑے نیں اوہ سارے رنگ نیں سوہے
ہجر تیرے دی اگ ایہی میرے جثے نوں پئی لوہے
کدی اوہ فیر میرے دل دے ویڑے آ کے کھیڈے گا
میں اج وی کھول کے بیٹھا واں اپنے یار لئی بوہے
کدی آرام نیں ملدا اے میرے روح دے پنچھاں نوں
دل نوں کتر دے رہندے نیں تیری یاد دے چوہے
توں آ کے ویکھ لے ہن حال میرا کنج دا ہویا اے
پتھر بولدے نیں کہ نہیں یارا قبراں دے بے رُوحے
نندا‌اں بھر کے ہنجواں نال شاہد میں وگا چھڈیاں
سٹ دے جار ہے نیں ہن میرے نیناں دے کھوہے
عبدالرشید شاہد/ننکانہ صاحب

ملک کے نامور کالم نویس سیّد احتشام ضمیر کے کالموں کا پہلا مجموعہ

متاعِ ضمیر

شائع ہو گیا ہے

کتاب سے متعلق نامور ادیب عامر بن علی کا تبصرہ

عصر حاضر کے اہم مسائل کا ہلکے پھلکے انداز میں تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ صحافت اور ادب میں ظرافت نگاری کو مشکل ترین صنف خیال کیا جاتا ہے۔ کالم نویسی کے فن میں جو شگفتگی اور برجستگی سید احتشام ضمیر کے ہاں پائی جاتی ہے وہ سخن وروں کی کہکشاں میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے۔ ان کے طنزیہ نشتر بھی شگفتگی میں بجھے ہوئے ہیں۔ نازک سے نازک بات ایسی سہولت اور شائستگی سے لکھ جاتے ہیں جسے کہتے ہوئے اچھے اچھے لکھاریوں کے قلم کی سانس پھول جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بیک وقت شوخی و پرکاری بھی ہے اور سادگی و سلاست بھی۔ اخبار میں ان کا پہلا کالم پڑھتے ہی میرے ذہن میں تو یہ سوال اُبھرا تھا کہ ایسا باکمال لکھاری اب تک دریافت کیوں نہ ہو سکا؟ اور کیونکر قارئین کی نظروں سے اوجھل رہا؟ عین ممکن ہے ''متاعِ ضمیر'' پڑھ کر آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آئے۔ خیر دیر آید، درست آید۔

سید احتشام ضمیر اور سید ضمیر جعفری کا تقابلی جائزہ تو کسی بھی اعتبار سے جائز نہیں ہوگا مگر مشتاق احمد یوسفی کا یہ کہنا کہ ''احتشام ضمیر کے قلم میں باپ والی کاٹ ہے'' اپنی جگہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ ان کے موضوعات میں ایسا تنوع ہے جو ہم عصر اہل قلم میں کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک خوبصورت پہلو تو ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ اپنی کہی ہوئی باتوں کو دہراتے نہیں ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ ان کے کالم کا انتظار رہتا ہے۔ آج کل ہمارے ذرائع ابلاغ میں مایوسی کی بات کرنا فیشن ہے، ایسے ماحول میں اُمید اور روشن مستقبل کی بات کہنے کے لیے کافی حوصلہ درکار ہے۔ میرے نزدیک تو یہ عمل عین عبادت ہے۔ سید احتشام ضمیر کا امتیاز ہے کہ انہیں حقائق کا مکمل ادراک ہے۔ اس کے باوجود وہ پاکستانی قوم کے روشن مستقبل کے لیے پُر اُمید ہیں۔ مقبولیت کی بجائے معقولیت ان کے نزدیک زیادہ اہم بات نظر آتی ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں بھی دردمندی چھلکتی ہے۔ عمومی طور پر اساتذہ کرام کالم نویسی کو ادب کا حصہ نہیں مانتے مگر میری رائے میں ''متاعِ ضمیر'' ادبِ عالیہ میں داخل ہے۔ ادب کے قاری کی حیثیت سے میں ان کا ذاتی طور پر اس بات کے لیے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے وطن عزیز کے سپاہی کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دینے کے بعد دفاعی تجزیہ کار بننے کی بجائے قلم کے ذریعے خدمت کو افضل سمجھا۔

اعلیٰ طباعت، معیاری امپورٹڈ کاغذ پر اس کتاب کو نستعلیق مطبوعات لاہور نے شائع کیا ہے۔ متاعِ ضمیر کا دیباچہ عطاء الحق قاسمی نے تحریر کیا ہے۔ ان کے علاوہ جمیل یوسف، انور نسیم، روبینہ تحسین بینا، سرفراز شاہد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، جبار مرزا، الطاف حسین قریشی اور راقم الحروف کی آرا اس کتاب میں شامل ہیں۔

کتاب کا سرورق بڑا جاذب نظر ہے۔ کتاب میں رنگین تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں۔ کالموں کے مجموعے کے لیے تصویروں کی شمولیت ایک نیا تجربہ ہے۔ مگر دیدہ زیب اور خوب لگ رہا ہے۔

تین سو صفحات پر مشتمل اس خوبصورت کتاب کی قیمت صرف 400 روپے ہے۔

ناشر:

نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر، غزنوی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

0423-7351963 / 0331-4489310

nastaique786@gmail.com

امریکہ میں مقیم نامور سفرنامہ نگار شاعرہ، افسانہ نویس اور ناول نگار

نصرت منظور

کا پہلا ناول

اُفق کے اُس پار کی چاہ میں

نہایت خوبصورت گیٹ اپ اور امپورٹڈ آفسٹ پیپر پر شائع ہو گیا ہے

اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ناول منفرد ہے

نامور شاعر، سفرنامہ نگار اور صحافی

جعفر حسن مبارک

کا شعری مجموعہ

تنہا رہنا سیکھ لیا ہے

ناشر:

مثال پبلشرز، رحیم سنٹر پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے

پاکستان میں سب سے زیادہ شعری مجموعے

شائع کرنے والے ادارے

نستعلیق مطبوعات

فیروز سنٹر، غزنوی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

0423-7351963 / 0331-4489310

nastaique786@gmail.com

راولپنڈی میں مقیم معروف شاعر

نوید ملک

کا پہلا شعری مجموعہ

کامنی

شائع ہو گیا ہے

ناشر: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی

میں گیا وقت نہیں ہوں

کینیڈا میں مقیم نامور شاعر

اشفاق حسین

کا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے

اہتمام: شاہد پبلی کیشنز، کینیڈا

کینیڈا میں مقیم نامور شاعر اور نقاد اشفاق حسین کی

فیض احمد فیض کے حوالے سے کتاب

شیشوں کا مسیحا

منظر عام پر آ گئی ہے

جو کہ فیض احمد فیض کے حوالے سے اُن کی لکھی ہوئی پانچ کتابوں کا مجموعہ ہے

اہتمام: شاہد پبلی کیشنز، کینیڈا

Vinda
Tissue Papers
پاکستان میں پہلی بار
ٹیشو پیپر کی مکمل رینج کے ساتھ
Babifit Diaper
نہ گیلے نہ ریشز کا ڈر
بے بی خوش تو ماں بھی خوش
3Ply, 2Ply اور 4Ply ٹیشو پیپرز
متعارف کروانے والی واحد کمپنی
Alif Traders
Authorized Dealer in Pakistan
www.vindapakistan.com
info@vindapakistan.com
042-37246101
0345-4680665, 0333-4302200

A.T
ALFA ACCESSORIES
موبائل فون اسسریز میں اعلیٰ نام
چارجر
بیٹری
کیسنگ
ہینڈ فری
پاؤچ
سکرین پروٹیکٹر
اور تمام انٹرنل پارٹس
A.T MASTER
A.T-ALFA
BL-5C
LAMBI BAAT
Business centerFirst Floor Hall Road Lahore
www.atalfa.net
042-37210216

پلاک (PILAC) کے زیرِ اہتمام معروف شاعر حسن عباسی کے اعزاز میں تقریب

صدارت عطاءالحق قاسمی نے کی جبکہ مہمانِ خصوصی عامر بن علی تھے

نظامت: ڈاکٹر صغرا صدف

حسن عباسی

عطاءالحق قاسمی، نجیب احمد، حسن عباسی، عامر بن علی

اظہارِ خیال: عطاءالحق قاسمی، عامر بن علی، نجیب احمد، باقی احمد پوری، عباس، تابش، حسین مجروح، ڈاکٹر ضیاءالحسن، ڈاکٹر کوثر محمود، صوفیہ بیدار، حافظ مظفر محسن، ابرار ندیم، قندیل، ملک سلیم اختر

منظوم خراجِ عقیدت، اقبال راہی، فرحت زاہد، ناز اوکاڑوی، راجہ نیر

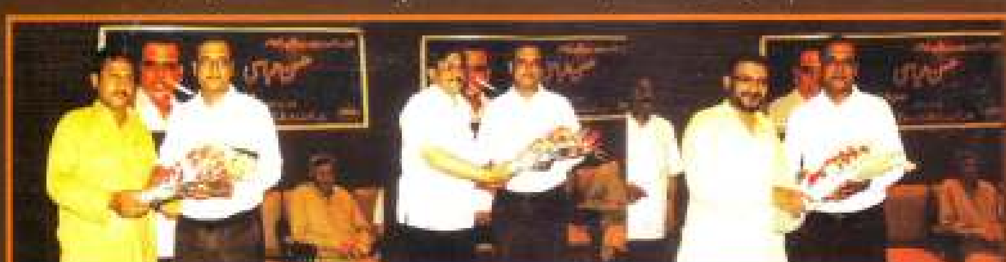

گلدستے پیش کرتے ہوئے۔ احمد سبحانی آکاش، ملک سلیم اختر، محمد اقبال پیام

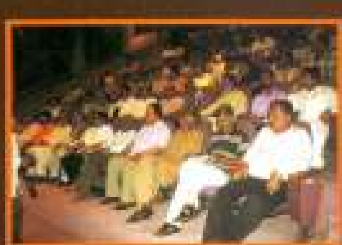

حاضرین

عابد علی خیالی پورٹریٹ پیش کرتے ہوئے